جلد ۱۰۵
اپریل ۱۹۸۶ء
عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی شہرہ آفاق تصنیف

تفہیم القرآن

کے مختلف موضوعات کو الگ الگ کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے

انسان

کے موضوع کو الگ کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے۔

آئندہ آنے والا موضوع

آخرت

خواہشمند کرم فرما دفتر سے رجوع کریں

ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ۔ رحمٰن مارکیٹ ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار ۔ لاہور ۔ فون نمبر: ۳۲۴۴۶۸ / ۶۸۶۳۶

فہرست مضامین

جلد ۱۰۵ | اپریل ۱۹۸۶ء مطابق شعبان ۱۴۰۶ھ | عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

زرِ سالانہ تیس روپے۔ فی پرچہ تین روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

لمحۂ حاضر میں ملک بڑی مشکلات سے دوچار ہے، جمہوریت کا تجربہ ابھی معرضِ آغاز میں ہے، حکومت پوری طرح قابو یافتہ نہیں، سیاسی جماعتیں ابھی اُٹھ کر پوری طرح تنظیم تو بھی نہیں کر پائیں، لیڈروں کی مختلف بولیاں ہیں اور ان میں زور کی بانگیں دینے والے وہ ہیں جنہیں پاکستان سے محبت کرنے کا صرف یہی حکیمانہ نسخہ معلوم ہوا ہے کہ دشمنانِ پاکستان کی لے میں لے ملائیں، دو بڑی سپر پاورز کی سرپرستی میں اسرائیل اور بھارت ہمارے لیے اپنی ڈپلومیسی سے بارودی سرنگیں بچھا رہے ہیں۔ پاکستان میں لادینیت نے جتنا زور آج پکڑا ہے اتنا پہلے کبھی نہ تھا، لادینیت کا سارا لاؤ لشکر — کمیونسٹ، الحاد اور تفریقِ دین و سیاست کے علمبردار، نوکر شاہی کے افسر، جمہوریت کا کھلا میدان ملنے پر اس میں ہنگامہ خیزی کا کھیل کھیلنے والے کوچہ گرد سیاست باز، قادیانی، منکرینِ حدیث، مغرب پرست بندگانِ مفاد، دولت و جاہ کے سرمست اور وڈیرے اور جاگیردار، اہلِ سیاست کے ہاتھ میں کام کرنے والے مجرم اور غنڈے ایک بڑا وسیع محاذ قائم کیے ہوئے ہیں جو سیاسی جماعتوں، مذہبی گروہوں، افسر شاہی اور وزیروں اور قومی نمائندوں کے مختلف دائروں میں پھیلا ہوا ہے اور اس محاذ کی لڑاکا فورس کی رگوں میں مختلف ملکوں کا روپیہ کام کر رہا ہے۔ اتنی پیچیدہ ہے صورتِ حالات۔

ایسے نازک حالات میں چاہیے تو یہ تھا کہ ہر وہ شخص اور گروہ جو دین سے محبت رکھتا ہو

وہ آج سے پہلے کے چند سالوں میں اس مہم پر نکلا ہوتا کہ وہ دینی قوتوں سے اتحاد پیدا کرے گا، ان کو اختلاف کرنے یا رکھنے کے صحت مند طریقے سکھائے گا۔ اُن کو محبت سے بات کرنے کا سلیقہ بتائے گا۔ ان میں دین و ملت کی بھلائی کے لیے مسلمانوں میں وحدتِ مقصد پیدا کرنے کا والہانہ جذبہ اُبھارے گا۔ مگر افسوس کہ کئی برس سے افتراق کی مہمات چلتی رہیں اور خصوصاً ہمارا ذکر تو اکثر بہت گھٹیا انداز سے یہ کہہ کر کیا گیا کہ بس ایک جماعتِ اسلامی کے ساتھ اتحاد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ جہاں جماعت ہو گی، وہاں ہم نہ ہوں گے۔ یعنی ہم پر ایک حملہ ایم آر ڈی کا، ایک حکمرانوں اور بیوروکریسی کا اور ایک مولویانِ کرام کا ـــــ یعنی ہمارے خلاف شیخ و رند ایک مقام پر بغل گیر ہو گئے ـــــ ایک آواز میخانے سے اُٹھتی ہے، ایک بُت کدے سے اور ایک مسجد و خانقاہ سے۔ عقلاً اس تثلیث کی تشکیل سمجھ میں نہ آئے گی۔

یہ اس لیے کہ کمیونسٹوں، سیکولرسٹوں، مادہ پرست دانش مندوں، بندگانِ دولت و جاہ اور سرمستانِ عیاشی و فحاشی سب کی نگاہ اس بات پر ہے کہ اصحابِ مسجد و مدرسہ ان کے لیے اس درجے کا خطرہ نہیں ہے جس درجے کا خطرہ جماعتِ اسلامی ہے جس کے افراد شعوری ایمان رکھتے ہیں، حالات پر نظر رکھتے ہیں، مخالفِ اسلام نظریوں اور تحریکوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ معاشرے میں لادینیت جس بھی فتنہ کو اُٹھاتی ہے، وہ چاہے دستور کے کسی نکتے سے متعلق ہو یا خواتین کی ناموزوں آزادیوں سے، طوفان فلسطین سے اُٹھے یا افغانستان سے، قصہ داخان کا ہو یا سیاچین کے گلیشیر کا، کسی جگہ سلسلہ جنبانی رُوس کی ہو یا حرکت انگیزی امریکہ کی، جماعتِ اسلامی گرفت کرنے میں پیش پیش رہتی ہے اور ہر خطرے سے مسلمانوں کو دلائل و شواہد کے ساتھ آگاہ کرتی ہے۔ مخالف قوتیں اس لیے جماعت کے خلاف چڑھتی ہیں کہ یہ نہ اُن سے خوف کھاتی ہے، نہ بکتی ہے اور نہ کبھی گردن میں خم آنے دیتی ہے۔ حتیٰ کہ مشرقی پاکستان میں اس کے نوجوانوں نے بھارتی حملہ آوروں کی طوفانی قوت

سے پنجہ آزمائی کر کے دکھا دیا کہ وہ ایک زندہ، اور زندہ رہنے کی مستحق قوت ہیں۔ اس حقیقت کو انہوں نے اپنی لاشوں کی الواح پر اپنے خون سے ثبت کر دیا۔ پھر جماعت کے لوگ جیلوں میں گئے اور مقدموں اور ضبطیوں سے گزرے۔

یہ مقام پسند خوب صورت نعرے لگانے، عرسوں میں قوالیاں سننے اور میلاد شریف کا حلوہ اڑانے، جلوس نکال لینے، جلسہ کر لینے سے تو نہیں مل سکتا۔ خصوصاً دوسروں کو بہت گالیاں دینے سے اور ان پر حملہ کرنے اور کاریں جلانے سے اور اس کے بعد دوسروں کے خلاف غلط پروپیگنڈے کا طوفان اٹھا دینے سے تو اور دور ہو جاتا ہے۔

جمعیت اہل سنت کے بارے میں یہ بات بڑی اندوہ ناک ہے کہ اگر وہ کئی برس سے اتحاد کی راہ پر گامزن نہیں کر سکے اور نہ ہمیں اس کی اجازت انہوں نے دی تو کم سے کم ان کے مدعیانِ بلند بانگ سطحی اخباری پروپیگنڈے کے بجائے سارا معاملہ کسی معتمد علیہ بزرگ کے پاس لے جاتے اور ان کی خدمات مصالحت یا ثالثی کے لیے حاصل کر لیتے تو بات پردے میں ختم ہو جاتی۔ اب انہوں نے اپنے سارے کارنامے کو الم نشرح کرانے پر کمر باندھ لی ہے۔ کیا یہ اچھا لگے گا کہ جمعیت اہل سنت کے علماء کی کچھ باتوں کی صداقت پر خطِ نسخ کھنچ جائے اور کہا جائے کہ مولوی جھوٹ بولتے ہیں۔ دس بار سوچیے!

اس وقت جو مشین گن طرز کی بیان بازی بہ حمایت بعض اخبارات علمائے اہل سنت کی طرف سے ہو رہی ہے، اور دوسری طرف کے "جواب وصولی" کی اشاعت میں سستی دکھائی جا رہی ہے اُسے دیکھ دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں تصویروں سے بھری ہوئی رنگین اخبار نویسی کا زور ہو جانے کے باوجود اچھی، صحیح اور مکمل رپورٹنگ کا تجربہ شروع نہیں ہوا، ورنہ ہر سلسلۂ واقعات کی پوری سٹوری دیانت داری سے مرتب کر کے رپورٹ اس طرح پیش کی جاتی کہ پولیس کی تفتیش بھی اُس کے خطوط کو نظر انداز نہ کر سکتی۔ ۶ مارچ کو جس طرح یہ ضروری تھا کہ جماعت اسلامی کے جلسے کی رپورٹنگ کے لیے ڈیوٹیاں لگیں،

اسی طرح جمعیت اہلِ سنّت کے جلوسوں کی بھی آغاز سے آخر تک پوری رپورٹنگ اس طرح ہوتی گویا لفظوں میں فلم دکھا دی گئی، اور اسلامی جمعیت طلبہ کی ریلی کی بھی۔ مگر مکمل رپورٹنگ کے بجائے بکھری بکھری خبریں اور بیانات اور اُن میں بھی کسی خاص طرف جھکاؤ، اخبارات کے ذریعے حقیقت معلوم کرنے والوں کو عجیب وادیوں میں بھٹکا دیا جاتا ہے۔

چار و ناچار میں نے متفرق ذاتی معلومات پر مبنی مکمل "سٹوری" مرتب کی ہے۔ دراصل میں ان اوراق کے ذریعے اس اُمید کے ساتھ قریبی دوستوں تک پہنچا رہا ہوں کہ وہ آگے زیادہ سے زیادہ پھیلا کر اس زہر کا توڑ کریں جو اگر معاشرے کی رگوں میں سرایت کر تا گیا تو بہت بُرے نتائج نمودار ہوں گے۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ دُور بیٹھ کر سوچنے والوں نے بہت بڑی شرارت کا جو منصوبہ سوچا تھا، وہ درہم برہم ہو گیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ جمعیت طلبہ کے کئی ہزار نوجوان اپنے پورے زعم قوت کے ساتھ اشتعال میں آئیں اور سڑک پر ایسی فائرنگ اور دست بدست لڑائی ہو کہ سڑک پر سینکڑوں لاشے پڑے ہوں اور پھر ایک طرف تو ملک بھر میں اشتعال کے بگولے اُٹھا دیے جائیں اور مسجد مسجد اور گلی گلی خون خرابہ ہو رہا ہو، دوسری طرف اسلامی جمعیت طلبہ کے خلاف تشدد کے جھوٹے الزام کا جو پتلا پہلے سے بنا بنایا رکھا ہے اس پر خون چھڑک کر اس میں نئی رُوح پھونکی جائے۔ اور جس اصل چیز سے جمعیت اہلِ سنّت کے اصحابِ علم اور اربابِ تقویٰ واقف نہیں، یہ پیشِ نظر تھی کہ اس سلسلہ واقعات کے بعد کمیونسٹ اور ملحد لادین عناصر یہ پروپیگنڈا پلیٹ فارم، پریس، گلی کوچوں اور پارلیمان تک میں کریں کہ دینی عناصر لڑنے بھڑنے والے تشدد پسند اور اختلاف کا تحمل نہ رکھنے والے لوگ ہیں، ان کے نظریات و تصورات پر اگر ریاست اور معاشرے کو چلایا گیا تو سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد سیکولرازم کا ناگ اور کمیونزم کا ریچھ ایوانوں ہی میں نہیں، سڑکوں اور چوراہوں پر ناچیں گے۔ پڑھیے گا اس وقت تسبیحات اور قنوتِ نازلہ، کیونکہ باقی تدبیروں کے دروازے تو بند ہو جائیں گے اور بے لبی جکڑ لے گی۔ یہی وسط ایشیا کی ختم شدہ مسلم ریاستوں میں ہوا کہ مولویانِ کرام نے

دینی اور قومی لڑائی سے زیادہ ضروری یہ سمجھا کہ عقائد اور مفاد کی اپنی اپنی گروہی لڑائیاں اچھی طرح لڑ لیں۔ ہم تاریخ کے ٹیلی وژن پر پہلے سے یہ تماشا دیکھ چکے ہیں۔ وہی ڈرامہ اگر ہمارے سامنے دہرایا جائے تو ہم اس کے کرداروں کو بھی پہچانتے ہیں اور اس کے ہتھکنڈوں کا توڑ بھی کر سکتے ہیں۔

اصل خطرہ ٹل جانے کے باوجود بارود کی سرنگیں دُور دُور تک پھیلانے اور بچھانے کا کام جاری ہے۔ بخصوصیت سے ۲۰ مارچ کے احتجاجی جلسے میں ایک بار پھر اشتعال انگیز تقریروں اور نعروں اور قراردادوں اور گالیوں کی توپوں کے دہانے کھلیں گے تاہم ہمیں یقین ہے کہ ہمارے صبر کا ٹھنڈا پانی ساری بارود کو ناکارہ بنا دے گا۔ الّا یہ کہ بیچارے کئی سادہ لوح خادمانِ علماء کے دلوں میں زہر بھر جائے گا۔ (یہ جلسہ بھی ہو چکا!)

نوجوانوں کی ریلی کے دن بزرگوں کے جلوس کا قصّہ ہر محبِ دین و ملت کے لیے رنج و شرم کا باعث بنا۔

اسلامی جمعیت طلبہ نے ۲۵ جنوری کو ریلی کا اعلان کر دیا تھا اور اس کے لیے ۶ مارچ کی تاریخ مقرر کر دی تھی۔ مقصود یہ تھا کہ استحکامِ پاکستان کے لیے تجدیدِ عہد کی تقریب ہو جائے۔ حکومت کی انتظامی روایت بھی ہے اور سیاسی و اجتماعی اخلاقیات کا تقاضا بھی کہ ایک گروہ کی طرف سے اگر کسی جلسے، جلوس، ریلی کا اعلان کسی خاص دن کے لیے پہلے ہو چکا ہو تو کسی دوسرے گروہ کو اسی دن اسی طرح کا کوئی پروگرام نہیں رکھنا چاہیے یا اس کے لیے مقام اور راستہ اور وقت الگ رکھنا چاہیے۔ مگر اسلامی جمعیت طلبہ کے اعلان کے دو ہفتے بعد جمعیت اہلِ سنّت کے لیڈروں نے ۶ ہی مارچ کو احتجاجی جلوس نکالنے کا اعلان کر دیا۔ اس معاملے میں حکومت کی انتظامی مشینری نے کوئی حرکت نہیں کی، حالانکہ روایت یہ ہے کہ بعد میں اعلان کرنے والوں کو روک دیا جاتا رہا ہے۔ کیا جواب ہے حکومت کے پاس اس کا؟

بہ ہر حال اسلامی جمعیت طلبہ کے سربراہوں نے اس امر کو نامناسب محسوس کرتے ہوئے اے سی اور ایس ایس پی سے ملاقات کی اور تشویش کا اظہار کیا، نیز یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ جلوس کا رُوٹ کیا ہوگا۔ دونوں افسروں نے بتایا کہ ہم نے اہل سنّت کے علماء سے پوچھا ہے، انہوں نے کہا کہ رُوٹ ابھی ہم نہیں بتا سکتے۔ عین وقت پر بتائیں گے۔ کیا عجیب صورت ہے کہ حکومت کے افسران پوچھتے ہیں اور جواب نہ ملنے پر دم بخود ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اتنا ہی حکم جاری ہو سکتے ہیں۔ آخر افسران نے یہ کہا کہ ہم کوشش کریں گے کہ روٹ الگ الگ رہیں۔

اُدھر روٹ کے معاملے میں اتنا اخفا کہ ۶ مارچ کے اخبارات میں بھی اس کی کوئی خبر نہیں، بلکہ یہ کہا گیا کہ روٹ کا فیصلہ عین وقت پر کیا جائے گا۔

کیا حکومت اتنی بے بس تھی کہ عین آخری دن بھی جلوس نکلنے سے قبل معلوم نہیں کر سکتی تھی کہ روٹ کیا ہوگا۔ اور اگر معاملہ اتنا پراسرار رکھا جا رہا تھا تو وہ جلوس کو روک بھی سکتی تھی۔ اور اگر اسے نکلنا ہی تھا تو اتنی پولیس فورس مہیا کر سکتی تھی جو کسی مناسب روٹ پر جانے کی اجازت دیتی، مگر کسی غلط رُخ پر مُڑنے سے قطعیت کے ساتھ روک دیتی۔ بارہا غلط نوعیت کے جلوسوں اور غلط رُخ پر جانے والے جلوسوں کو اسی لاہور میں روکا گیا ہے۔

پھر کیا موقع پر حکومت کے ایسے کارندے موجود نہ تھے جو جیپوں یا سکوٹروں یا وائرلیس کے ذریعے انتظامی حکام اور اپنے ہیڈ کوارٹر کو اس امرواقعہ سے آگاہ کر سکتے کہ مسجد داتا دربار ہی میں جلوس کے ڈنڈا بردار دستے موجود تھے۔ اور "کاہو" کے ڈنڈوں کے بندھے ہوئے گٹھے ان کے لیے لائے گئے جن کی قیمتیں اندازاً ۳/ روپے فی ڈنڈا تھیں۔ کیا یہ سب کچھ کارندوں کو دکھائی نہیں دیا؟ کم سے کم ڈنڈوں کے گٹھوں کو تو وہ قبضے میں لے سکتے تھے۔ یا کیا ان کو تبلیغ دین کے اوزار و آلات میں محسوب کیا گیا؟ یا اسلحہ جہاد کہ جو تبلیغ کے آگے سر نہ جھکائے اُس کی خبر ڈنڈے سے لی جائے۔ کیا اس قسم کے مشاغل پر سنّت کا اطلاق ہو سکتا ہے؟

مسجد میں جمعہ کے دن جو تقریریں اہلِ سنت کے اکابر حضرت محمود احمد رضوی اور مولوی احمد علی قصوری نے لوگوں کو سنائیں ان میں مولینا مودودیؒ اور میاں طفیل محمد امیر جماعت اسلامی اور خود جماعتِ اسلامی کے لیے گھٹیا الفاظ مسلسل استعمال کئے گئے۔ ان تقریروں میں دین کی تبلیغ اور خدا اور رسولؐ کی باتوں اور اُمتِ محمدیہ کے لیے محبت کے کلمات کے بجائے بد زبانی کی جاتی رہی۔ جس کی گواہی مسجد اور مزار دونوں خدا کے سامنے دیں گے۔ ایسا معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ کوئی مذہبی یا دینی جلسہ ہے! اس میں علماء اپنی زبانوں سے نور بکھیر رہے ہیں۔

تقریروں کی بانگی ملاحظہ کرنے والوں نے یہ دھمکیاں بھی سنیں کہ ہم دیکھ لیں گے کہ جماعتِ اسلامی کس طرح جلسہ (۶ مارچ موچی دروازہ) کرتی ہے!

یعنی اصل ہدف تو جماعت اسلامی کا جلسۂ عام تھا۔ بیچ میں اسلامی جمعیت طلبہ سے چھیڑ چھاڑ کے لیے تو چھوٹے اسٹیشن پر گاڑی اتفاقاً رک گئی کہ پہلے دو دو ہاتھ یہاں ہو لیں مگر کیا پھنس کر رہ گئی۔ جلسے تک نہ پہنچ سکی۔ (بلکہ لاہور کے بعد سکھر میں بھی جلسہ ہوگیا!) جلوس چلا ــــ اور گالیوں کے پھول فضا میں بکھرنے شروع ہوئے۔ علماء کی گالیاں ــ مقدس گالیاں ــ شرعی گالیاں ــــ زہد و تقویٰ کا یہ جلوس اور سنت و جماعت کے علمبرداروں اور خاص مرتبے کے محبانِ رسولؐ کا جلوس ـــــــ چلا۔ اس مقدس جلوس میں ایم۔ ایس۔ ایف کے قائدین شریک! ــ حافظ سلمان کے انتخابی مرحلے کے دفائرنگ کرنے والے) مخالفین جنہیں اکابرِ خاص کی سرپرستی حاصل تھی، اس شرعی مجاہدانہ کارروائی میں شامل! محمد نواز کا ایک ملزم قاتل جو ضمانت پر ہے، جناب رضوی کے اس قافلہ تقویٰ میں رونق افروز! ــ خود حضرت صاحب کا صاحبزادہ اشرف مختار کلاشنکوف اچھال اچھال کر دکھا رہا تھا۔ کچھ اور لوگوں کی ایک پارٹی رائفلیں اُٹھائے پیش پیش تھی۔ جی۔ پی۔ او کے قریب سے جلوس یونیورسٹی کی طرف مڑا تو ایک مجسٹریٹ اور ایک ڈی۔ ایس۔ پی نے مظاہرین کو اس طرف بڑھنے سے روکا۔ مگر جلوس کے مجاہدوں نے ان افسران کو زخمی کر کے زبردستی سے اپنا رُخ یونیورسٹی جاتے

کے لیے موڑ دیا۔
سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر جلوس کے شرکا اور اس کے لیڈر اتنے ہی لاڈلے بنتے تو مجسٹریٹ صاحب اور ڈی۔ ایس۔ پی نے یہ تکلف کیا ہی کیوں تھا کہ کاروانِ زہد و تقویٰ کے آڑے آتے۔ اُن کا عالم تو یہ تھا کہ اگر اُن سے بہ طورِ استفہام پوچھا جاتے: "ورنہ؟" تو وہ بصد عجز عرض کر دیں کہ "ورنہ حضور ہم نوکری کریں گے۔" سو خوشی ہے کہ اُن کی نوکری سلامت رہی۔
شاید دورِ جمہوریت کی پولیس کا نیا طریق کار طے کیا گیا ہے کہ وہ کسی کو تجاوز عن الحدود سے روکنے کے لیے عرض معروض کریں، مانے نہ مانے، ورنہ کہیں، حضور! گستاخی معاف، آپ بخیریت و سلامت، جائیے۔ کوئی چور بھی اگر تالہ توڑتا دکھائی دے جائے تو دست بستہ عرض کیا جائے کہ جناب اگر ناراض نہ ہوں تو التماس ہے کہ تالہ نہ توڑیے۔ وہ آگے سے فوں فاں کرے تو پھر مزید عاجزی سے کہیں کہ "سرکار غصہ تھوک دیں، تالا کھولنے کے لیے کنجی ہم دیتے ہیں۔ تالہ ٹوٹے گا تو قومی نقصان ہوگا، اور اگر آپ قومی نقصان کرنا پسند کریں تو قوم تو آپ خود ہی ہیں۔ ہم تو محض قوم کے نوکر اور آپ کے خادم ہیں"۔ اگر ایسا ہو تو دنیا میں پولیس کے استعمال کا یہ بہت ہی نیا نرالا تجربہ ہوگا۔ اور میرا خیال ہے کہ پھانسیوں، جیلوں، زنجیروں، عدالتوں، تھانوں اور حوالاتوں سے نجات ہو جائے گی۔ بڑی بچت بھی ہوگی اور بڑا سکون بھی ہوگا۔ ساری خرابی قانون پسندوں کی وجہ سے ہے۔ اگر قانون شکنوں کی برتری قائم ہو جائے تو سارے شر خشے ختم!
تو ہاں جناب! علمائے اہل سنّت سارا جلوس ساتھ لیے عین یونیورسٹی کے اس حصّے کے سامنے جا پہنچے جہاں اسلامی جمعیت طلبہ کی ریلی انجینئرنگ کالج سے وہاں پہلے آچکی تھی اور رسں پندرہ ہزار نوجوانوں کے لیے دینی تربیت گاہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور وہاں تقریریں کرنے کے لیے جماعت کی چند اہم شخصیتوں اور ایم این اے حضرات کے علاوہ پریشان خٹک سابق وائس چانسلر گومل یونیورسٹی، جہاد ۶۵ء کے ہیرو ایم۔ ایم عالم اور سندھ سے پروفیسر کریم بخش نظامانی جیسی ہستیاں موجود تھیں۔ پریشان خٹک اور ایم ایم عالم کے مختصر

بیان بھی شائع ہوئے ہیں۔

یہاں جلوس دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ــــ اپنے کسی مقررہ پروگرام کے تحت ایک حصہ ٹولنٹن مارکیٹ کی جانب بڑھ گیا اور ایک نے پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس کے سامنے رُک کر مورچہ سنبھالا۔ گھٹیا نعرہ بازی کے ساتھ پہلے پٹاخے چھوڑے گئے۔ پھر سنت والے علماء کے فائرنگ اسکواڈ نے ایسی سخت فائرنگ کی کہ عینی شاہدوں کے بیان کے مطابق گویا کوئی محاذِ جنگ ہو۔ پھر جب تقویٰ کی آگ بہت ہی بھڑکی تو ان حضرات نے یونیورسٹی کی جانب تین کاروں اور چار سکوٹروں اور موٹر سائیکلوں کو (جن کا تعلق جمعیت ہی کی تربیت گاہ سے تھا) آگ لگا کر تباہ کر دیا۔ دوسری طرف ٹولنٹن مارکیٹ کی طرف جو بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں (جن میں ایسی بھی ہوں گی جن کے مالک طلبہ کی تربیت گاہ میں شریک ہوئے ہوں گے)، ان پر کاہو کے ڈنڈے برسا کر شیشے توڑے گئے اور ڈینٹ ڈالے گئے۔

ہاں اوپر کے ذکر کردہ سلسلۂ واقعات میں یہ بھی ہوا کہ سنی علماء حضرات نے یونیورسٹی کا وہ گیٹ توڑنا شروع کیا جو ڈائریکٹریٹ کی طرف واقع ہے۔ صرف یہ ایک ایسا اقدام تھا کہ جس کی تھوڑی سی مدافعت اسلامی جمعیت طلبہ نے کی ــــ اور نہ کرتے تو ان پر لازماً حملہ کر دیا جاتا۔ اس جزوی مدافعاتی کارروائی کو اسلامی جمعیت طلبہ کے متعلق عنوان تشدد کے نیچے رکھ لیجیے۔ آخر حملہ آوروں کے خلاف مدافعتی کارروائی کا حق بھی کوئی چیز ہے۔

اسی دوران علماء نے خشت باری بھی کی۔ کچھ اینٹیں وہ تھیلوں میں بھر بھر کر ساتھ لائے تھے اور کچھ انہوں نے ایک دیوار توڑ کر حاصل کیں۔ ڈان کراچی مورخہ ۸ مارچ کی تصویر میں ایک محبِ رسول اینٹ پھینکتا اور دوسرا اینٹوں کی ایک ڈھیری میں سے اٹھاتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔

اس موقع پر یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ جو لوگ ان مجاہدین کے قریب سے گذرے ان میں سے دو ایک کو یہ کہہ کر پیٹا کہ تم جماعتِ اسلامی کے آدمی ہو اور بعض دوسروں لوگوں کے ساتھ بدسلوکی روا رکھی گئی۔

حضرت رضوی صاحب نے یہ بیان دے کر دراصل جلوس کی ہنگامہ آرائی اور دیگر لغویات کا بہ حیلۂ شرعی اعتراف کر لیا ہے کہ جلوس میں نامطلوب عناصر داخل ہو گئے ہوں گے اور ممکن

ہے کہ ان لوگوں کو خود جماعتِ اسلامی نے بھجوایا ہوا تھا۔ آپ نے یہ آخری فقرہ؟
عجیب بات یہ ہے کہ ایک پولیس انسپکٹر نے اعلان کیا کہ ۵ پولیس والے زخمی ہوئے ہیں۔
یہ لوگ بغیر وردی کے تھے۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ہنگامہ کرنے والے جلوس کا
ایک حصہ تھے؟ آیا انہیں مار تین تین روپے والے ڈنڈوں کی پڑی یا کسی اور قسم کی؟
وردی والی پولیس موقع پر موجود کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔ جب گاڑیاں جل چکیں تو پھر سپاہ
یونیورسٹی کی جانب لائن بنا کر کھڑے ہو گئے۔ یعنی ہاتھی کے دکھانے کے دانت اب دیکھے
جا سکتے تھے۔

یونیورسٹی کے سامنے جلوس لمبے وقت تک رہا، ہنگامے کا سلسلہ چلتا رہا۔ سڑک پر دھرنا
مار کر یہ لوگ اس اعلان کے ساتھ جمے رہے کہ جب اسلامی جمعیت طلبہ والے نکلیں گے تو ہم
اُن پر حملہ کریں گے، پھر نماز بھی وہیں سڑک پر پڑھی گئی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پولیس جو وہاں
موجود تھی، اس نے کیوں نہ ابتدا ہی میں جلوس کو وہاں رکنے یا نعرہ بازی کرنے اور اسلحہ اور
اینٹوں کا استعمال کرنے یا گاڑیاں جلانے سے روک دیا؟ آخر ہماری آنکھوں کے سامنے
کتنی بار مختلف جلوسوں کو کسی جگہ سے ہٹانے، کسی راستے سے روکنے یا کسی زیادتی کے ارتکاب
سے پولیس نے روکا ہے اور جہاں پولیس کمزور پڑی وہاں فوج کو طلب کر کے تقاضائے امن کو
غالب رکھا گیا۔ یہاں کیوں نہ ہو سکا کہ ایسے طوفانِ بدتمیزی کو روکا جاتا۔

اسلامی جمعیت طلبہ کے چار وڈیو کیمرے اُن کے اپنے پروگرام کے تحت کام کر رہے تھے:

۱؎ توجیہ واقعات کے لیے ایسی ایسی فقیہانہ موشگافیاں کی ہیں ہمارے محترم بزرگوں نے کہ
بس خدا یاد آ جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ان گاڑیوں میں اسلحہ لایا گیا تھا۔ اس دعوے کا کیا ثبوت؟
ایسا تھا تو آپ حضرات کو بہترین خداداد موقع ملا تھا کہ وہاں پر موجود پولیس کو آپ اسلحہ سے
آگاہ کر کے اُسے گاڑیوں سے برآمد کراتے اور گاڑیوں کو بھی ضبط کرا دیتے۔ قانون کو اپنے ہاتھ
میں لے کر مجرمانہ حرکات کرنے کے بعد پھر اپنی صفائی دینا اور اپنی صفائی کے ساتھ دوسروں
پر الزام رکھنا کسی اوسط درجے کے شریف شہری کو بھی نہیں سجتا، کجا کہ مولویانِ کرام کو ــــ
اور وہ بھی داتا دربار سے جلوس لے کر نکلنے والے علمائے اہل سنت کو!

کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس ریلی اور تربیت گاہ کے مناظر کو وہ دوسرے مقامات پر یا دوسرے ممالک میں بھی دکھا سکیں گے۔ بدقسمتی سے علمائے "جہاد" شروع کر دیا۔ تین کیمرے ایسی جگہ تھے کہ سلسلۂ حوادث کے مناظر ان میں محفوظ ہو گئے۔ اور یہ ایک بڑی دستاویزی شہادت ہے۔ حضرت بنوری صاحب اور مولینا عبدالستار نیازی اور ان کے ہمنوا فرماتے ہیں کہ یہ وڈیو فلم دکھانے کی پیشکش بے معنی ہے، کیمرہ ٹرک سے مناظر تیار کر لیے گئے ہوں گے۔ علماء اتنے دانشور تو ہوتے چاہئیں کہ دو... جان سکیں کہ تین مختلف زاویوں سے تصویریں لینے والے کیمروں میں ہم آہنگی تو کسی چالاکی سے پیدا نہیں کی جا سکتی۔

اب سنیے اسلامی جمعیت طلبہ کا حال۔ یہ نوجوان بیچارے استحکام پاکستان کے لیے یوم تجدید عہد منانے کو اٹھے تھے۔ انجینیرنگ کالج سے علی الصباح ان کی ریلی پنجاب یونیورسٹی میں منتقل ہوئی۔ یہاں تربیتی اجتماع تھا۔ اجتماع سے خطاب کرنے والے تمام معزز، ممتاز اور شریف اصحاب تھے۔ سب "علماء" نے نعرہ بازی کی اور گالم گلوچ اور دھمکیوں کی آوازیں ابھریں تو لیڈروں نے طلبہ کو صبر کی تلقین کی اور وہ صبر کے مجسمے بن گئے۔ ورنہ اگر طلبہ کو لیڈر اسی طرح اٹھا کھڑا کرتے جیسے علماء نے اہل سنت کو اٹھا لائے تھے۔ یا دس پندرہ ہزار طلبہ اطاعت امر اور بزرگوں کے احترام کی تربیت سے محروم ہوتے اور وہ سرکشی کر کے از خود اٹھ کھڑے ہوتے تو چند سو حملہ آوروں کی ہڈی بوٹی نہ ملتی۔ انہوں نے صبر کیا۔ انہوں نے جماعت اسلامی کے جلسے کی طرف جلوس بنا کر جانے کا طے شدہ پروگرام بھی ختم کر دیا۔ اور یونیورسٹی کے پچھلے راستے سے ایک ایک دو دو کر کے نکلے اور جلسہ گاہ تک جا پہنچے۔ یہ وہ طلبہ ہیں کہ جنہوں نے اتنی بڑی ریلی کا انتظام کیا مگر کیا مجال کہ انجینیرنگ کالج یا پنجاب یونیورسٹی یا کسی دوسرے تعلیمی ادارے میں اپنے مخالفین کے ساتھ کوئی تصادم کیا ہو یا دوسروں کو للکارنے اور دھمکانے کی حرکات کی ہوں۔ کیا ان کے طرز عمل سے علمائے اہل سنت کوئی اچھی بات سیکھ سکتے ہیں؟

اور آفرین ہے ان طلبہ کو جنہوں نے نتائج کے لحاظ سے ایک خطرناک تصادم سے معاشرے کو بچانے کے لیے اپنے خلاف بہت سی زیادتیوں کو صبر سے برداشت کیا۔

اب جماعت اسلامی کا پارٹ بھی جان لیجیے۔ یونیورسٹی سے جو لیڈر اور مقررین اور

ایم - این - اے حضرات موچی دروازہ کے جلسہ میں پہنچے، انہوں نے وہاں تقریریں کرنے کے باوجود نہ تو اہلِ سنّت کے قصّہ کو بیان کیا، نہ سامعین میں جذباتی ردِ عمل پیدا کرنے کے لیے کوئی بات کہی، نہ میاں طفیل محمد صاحب نے پوری رپورٹ معلوم کر لینے کے بعد بھی اس قضیے کو اچھالا اور نہ اسلامی جمعیت طلبہ کے نوجوانوں میں سے کسی نے علمائے اہلِ سنّت کے خلاف کوئی نعرہ بلند کیا - اُلٹا امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد صاحب نے اختتامی تقریر کرتے ہوئے اپنے سٹیج سے یہ صلائے عام دی کہ تمام دینی عناصر کو متحد ہو جانا چاہیے اور ذرا بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ کسی نوعیت کی تازہ تازہ زیادتی سے وہ متاثر ہیں اور ان میں کوئی ردِ عمل جذبہ موجود ہے -

جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ اور ان کے لیڈروں اور کارکنوں کے ایسے شاندار کردار کو دیکھ کر بجائے اس کے کہ زیادتیاں کرنے والے بزرگان کرام کچھ ندامت محسوس کرتے، اُلٹا انہوں نے مخالفانہ پروپیگنڈے کے طوفان کو اور تیز کر دیا ہے جس سے اُن کا مقصد یہ ہے کہ ظلم کرنے کے بعد مظلوم کو مجرم بھی تسلیم کرایا جائے اور اپنے ضمیروں کو سر نہ اُٹھانے دیا جائے -

حضرات علماء خواہ کسی گروہ سے متعلق ہوں، اُن سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ لادینی عناصر کی طرح کے سیاسی ہتھکنڈوں اور ہیر پھیر کے طریقوں کو چھوڑ دیں، سچائی اور کھرے پن اور اخلاص و محبت کو مسلک بنائیں، نیز اختلاف کریں تو حسنِ اختلاف کا معیار قائم کریں - کیسے بھی غلط طریقے آپ اختیار کریں، اس سے جماعتِ اسلامی ملیامیٹ نہیں ہو جائے گی، بلکہ اس کے برسوں سے پیش کردہ صاف ستھرے طرزِ عمل کو اللہ تعالیٰ ذریعۂ عزت بنائے گا - ہو گا صرف یہ کہ لادینیت کے آتشیں لاوے کا بہاؤ ذرا تیز ہو جائے گا اور جو قوتیں ہمارے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں وہ ذرا اور آگے بڑھ آئیں گی اور حصار تنگ کر دیں گی، اور اسی مقصد کے لیے وہ مختلف افراد اور گروہوں سے کام لے رہی ہیں، یہی روش رہی تو جماعت پر تو جو گذرے گی، گذرے گی، خود آپ کو نہایت خوفناک تجربوں سے گذرنا پڑے گا - اگر آپ اپنے طور اطوار بدل نہ لیں تو پھر تاریخ کی پکار یہ ہے کہ ع "ڈرو اُس سے جو وقت ہے آنے والا"

ایک اہم سوال مذکورہ صورتِ حالات نے یہ سامنے رکھ دیا ہے کہ حکومت، خصوصاً حکومتِ پنجاب کا پارٹ اس میں کیا تھا اور کیسا تھا؟

حکمتِ سیّد مودودیؒ

علمی، تحقیقی اور ادبی کام کی ضرورت

(ادارہ)

اجتماعی زندگی کا تفصیلی نقشہ

"موجودہ مرحلہ کی نزاکت کچھ اس وجہ سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ جہاں تک بنیادی افکار کا تعلق ہے۔ ان کو پھیلانے میں تو ہم بڑی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں، لیکن ہمارے پاس ایسی سیرت اور ایسی اعلیٰ قابلیت رکھنے والا ایک منظم گروہ مہیا نہیں ہو سکا ہے، جو دنیا کے سامنے اُن عملی تفصیلات کو پیش کر سکے جن کی مانگ ہمارے ان افکار پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے والے لوگوں میں فوراً پیدا ہو جاتی ہے۔ جب لوگ ہم سے اجتماعی زندگی کا وہ تفصیلی نقشہ مانگنے لگتے ہیں جو ہمارے نظامِ فکر کی بنیاد پر بننا چاہیے تو ہم اسے پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں ..... اس کے لیے صاحبِ فکر و محققین کا ایک گروہ درکار ہے۔ جو پیہم محنت اور کاوش سے اس کام کو انجام دیتا رہے۔"

(روداد جماعت حصّہ اوّل ص ۹۴)

مجتہد مفکرین و حکما

"ہمیں اہلِ قلم کا ایک ایسا لشکر تیار کر لینا چاہیے جو علوم و فنون اور ادب کے ہر پہلو سے نظامِ حاضر پر حملہ آور ہو سکے۔ کچھ سیاسی مفکر ہوں جو حال کی کافرانہ سیاست کے مکروہ خدوخال کو خوب نمایاں کریں، کچھ معاشی ماہرین ہوں جو رائج الوقت معاشی تنظیم کے عیوب کو کھولیں، کچھ علمائے قانون کی ضرورت ہے جو انسانی قوانین کی بے اعتدالیوں کو نمایاں کریں۔ اخلاق و نفسیات کے کچھ حکما چاہئیں جو عہد حاضر کے علم النفس اور علم الاخلاق کی کوتاہ بینیوں کی نشاندہی کریں اور اس تخریبی کارروائی

کے سامنے یہ لوگ علوم کی نئی تدوین کا تعمیری کام بھی سنبھال لیں۔ ان مجتہد مفکرین کو مدد بہم پہنچانے کے لیے ادیبوں، افسانہ نگاروں اور ڈرامہ نویسوں کا ایک گروہ بھی ضرور ہونا چاہیے، جو فکری میدانِ کارزار میں گوریلا وار لڑتا رہے۔

(رودادِ جماعت۔ حصہ اول ص ۱۰۰)

ہماری تحریک کا دل و دماغ علمی تحقیق کا شعبہ دراصل ہماری تحریک کا دل اور دماغ ہوگا۔ ..... ایک اکیلا آدمی ایسی ہمہ گیر و عالمگیر تحریک کے لیے علمی و فکری بنیاد فراہم کرنے کی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ اگر ہمیں واقعی نظامِ تمدن و اخلاق میں کوئی انقلاب برپا کرنا ہے تو ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ صرف اردو زبان ہی میں نہیں بلکہ متعدد دوسری زبانوں اور خصوصاً دو تین بین الاقوامی زبانوں میں بھی ایسا لٹریچر فراہم کر دیں جو اسلامی نظام کی پوری شکل و صورت سے دنیا کو آشنا کرے اور اپنی تنقید سے موجودہ تہذیب و تمدن کی جڑیں اکھاڑ کر دلوں اور دماغوں میں نظامِ اسلامی کی صداقت کا یقین اور اس کے کی خواہش پیدا کر دے۔

نیز ہمیں قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخِ اسلام کے متعلق جملہ علوم کی تدوینِ جدید کرنی ہوگی ــــ اور اسی طرح علومِ جدیدہ کو بھی اسلامی نقطۂ نظر سے از سرِ نو مدون کرنا ہوگا۔ یہ کام کیے بغیر ہم ہرگز یہ توقع نہیں کر سکتے کہ مجرد کسی عمومی یا عسکری تحریک سے کوئی حقیقی اسلامی انقلاب دنیا کے موجودہ نظامِ تمدن و اخلاق میں رونما ہو جائے گا۔

(رودادِ اول ص ۶۵/۶۶ - رودادِ کار ــــ بہ سلسلہ جماعت کے عارضی مرکز کا قیام - فروری ۴۲ء)

معاشی ترقی کے لیے اسلامی تدابیر

جناب سید اسعد گیلانی صاحب

(۲)

ذخیرہ اندوزی کی ممانعت تجارت میں بھی اندھا دھند دولت کمانے کو اسلام ناپسند کرتا ہے۔ اسے لوگوں کی باہمی ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ اشیائے ضرورت کی ذخیرہ اندوزی اور عام لوگوں کی بے بسی سے فائدہ اٹھانے کو سوسائٹی کے خلاف ناقابلِ معافی جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس سے اجارہ داری کی مختلف شکلیں بھی مردود قرار پاتی ہیں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے چالیس دن تک سامانِ غذا کو ذخیرہ کیے رکھا اُس کو اللہ تعالیٰ سے کوئی واسطہ نہیں، نہ اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی پرواہ ہے۔"

غرض جو شخص اپنی ذاتی منفعت کے لیے اجتماعی مفاد کو دانستہ مجروح کرتا ہے اور معاشرے میں مصنوعی طور پر احتیاج، بھوک اور خوف پیدا کرتا ہے۔ اسے اسلامی معاشرہ اپنا حصّہ سمجھنے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہے۔

قرآن مجید نے اس بات کی بھی شدید مذمت کی ہے کہ انسان جائز طریقے سے حاصل شدہ دولت کو ناجائز کاموں میں صرف کرے یا اپنے ہی معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے سوا دولت کا کوئی اور مَصرف اس کی نگاہ میں نہ ہو۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

"فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے

رب کا ناشکرا ہے"۔

"کھاؤ، پیو، مگر حد سے نہ گزرو۔ اللہ حد سے گزر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔ (الاعراف)

"اور ہم نے کتنی ہی ایسی بستیاں غارت کر دیں جو اپنی معاشی حالت پر اترانے لگی تھیں۔ تو یہ ہیں اُن کے گھر بار جو ان کے بعد بہت ہی کم آباد ہو سکے"۔ (القصص - ۵۸)

اسلامی نظامِ حیات اپنے پیروؤں کا یہ امتیازی نشان قرار دیتا ہے کہ وہ مادّی ساز و سامان استعمال تو کرتے ہیں لیکن اُن کے حریص اور غلام نہیں بنتے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"درہم کا پرستار ہلاک ہو، دینار کا بندہ ہلاک ہو، مخملی شال کا غلام ہلاک ہو، اور منہ کے بل گرے۔ پھر جب اُسے کانٹا چبھے تو وہ بھی نہ نکالا جائے"۔ (بخاری)

ان اُصولی باتوں سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اسلام کا مزاج نہ اندھا دھند دولت کمانے اور جمع کرنے کو گوارا کرتا ہے اور نہ ہی اسراف کو بلکہ میانہ روی کو پسند کرتا ہے اور قلبِ مُسلم کے اندر ایسا ذوق و احساس پیدا کر دیتا ہے کہ وہ راہِ اعتدال کو اختیار کرے۔

انہی اُصولوں کی روشنی میں اسلام نے اپنی اقتصادی پالیسی نہایت درجہ معتدل اور عادلانہ ترتیب دی ہے۔

حاجت مندوں کا محصول، زکوٰۃ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاقی، معاشی اور سیاسی اقدار کو عبادات سے الگ نہیں کیا۔ بلکہ ان سب کو باہمی پیوستہ کر کے زندگی کو ایک واحدہ قرار دیا ہے اس کی سب سے درخشاں مثال زکوٰۃ کا نظام ہے۔ زکوٰۃ ارکانِ اسلام میں شامل ہے جس طرح عبادات میں نماز فرض ہے اور اسلامی مملکت کا ایک قانونی ضابطہ ہے اس کا احترام سیاسی قوت سے کرانا ضروری ہے بالکل اسی طرح زکوٰۃ بھی فرض ہے جو کم نصیب اور مجبور و معذور لوگوں کا حق ہے جسے ادا کرنا لازم ہے۔ اسلام نے غریب لوگوں کو

دولت مندوں کی خیرات اور ان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ حصولِ رزق کو ان کا حق قرار دیا ہے جسے قانون کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس میں کسی احسان و امتنان کا دخل نہیں ہے۔ چنانچہ اس کی شرح بھی متعین کر دی گئی ہے اور اس کے حقداروں کو بھی قرآن مجید نے نام بنام گنوا دیا ہے۔ اس طرح اسلام کے نظام میں گویا یہ غریب ہیں جو امراء پر زکوٰۃ کے ذریعے ٹیکس عائد کرتے ہیں۔

انسان سرمائے سے برتر اسلام میں سود کو قطعی حرام قرار دے کر سرمایہ کو بلا محنت خود بخود بڑھتے چلے جانے اور محنت سے بے نیاز ہو جانے کے تصور کو بالکل ختم کر دیا گیا ہے، جس سے یہ بات آپ سے آپ ثابت ہو گئی ہے کہ اصل قدر و قیمت کے مستحق انسان اور انسانی محنت ہیں سرمایہ نہیں ہے۔ سرمایہ انسان کے لیے ہے، انسان سرمایے کے لیے نہیں ہے اس لیے انسانوں کو سرمایے کے لیے قربان نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ حسبِ ضرورت سرمایہ انسانوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

زمین خدا کی ہے پھر جو اسے آباد کرے اسلام کی نظر میں اللہ تعالیٰ نے اس زمین کو تمام انسانوں کے لیے مستقر بنایا ہے اور ان کے لیے متاعِ حیات اسی میں رکھ دی گئی ہے۔ اس لیے اس زمین سے انتفاع کا حق تمام انسانوں کو ہے، چاہے وہ کاشت کریں، فیکٹریاں بنائیں، معدنیات حاصل کریں یا اس پر گاڑیاں چلائیں۔ ہر شخص کو اپنے لیے مکان بنانے اور ایسا کاروبار کرنے کا حق ہے جو وہ متعینہ حدود کے اندر کرتا ہے۔ اسلام کا معاشی نظام جو متوازن اور معتدل ہے ہر فرد کی جائز پشت پناہی کرتا ہے۔ بنیادی ضروریات کے بارے میں اسلام کا سارا زور فرد کی پشت پر ہے۔ سرمایے اور انتظامیہ کی پشت پر نہیں ہے۔ دنیا اور اس کا یہ سارا ساز و سامان فرد کے لیے ہے۔ ادارے اور ریاستیں فرد نے اپنی سہولت کے لیے بنائی ہیں نہ کہ ان کی غلامی کرنے کے لیے۔

ملکیت کا حق اسلام میں انفرادی ملکیت کے حق کو پورے طور پر تسلیم کیا گیا ہے بشرطیکہ وہ جائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہو اور عامۃ المسلمین کے مفاد کو متاثر نہ کرے اور فساد کا ذریعہ نہ بن جائے۔ اسی طرح حقِ وراثت کو بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ گویا فرد کی وہ آزادی ہے

جو اسے کمانے کے لیے صلاحیت اور جذبہ و جوش فراہم کرتی ہے۔ اس کے بغیر فرد میں کام کا جذبہ پیدا کرنا خلافِ فطرت ہے۔

ملّت کے برتر مقام کا اہتمام

اسلام کے معاشی نظام میں ریاست کو اُفتادہ زمینوں کو قابلِ کاشت یا قابلِ استعمال بنانے کا پابند کیا گیا ہے تاکہ فرد اقتصادی ترقی کے لیے پوری پوری جدوجہد کر سکے۔ وسائلِ رزق میں سے کچھ چیزیں ریاست اپنی تحویل میں عارضی یا مستقل طور پر لے سکتی ہے بشرطیکہ عامۃ المسلمین کے مفاد میں یہ ہو۔ عامۃ المسلمین کا مفاد وہ مفاد ہے جسے عام لوگ واقعی مفادِ عامہ کے مطابق سمجھیں۔ صرف حکمرانوں کا سمجھنا کافی نہیں ہے اور حکمرانوں کی مرضی جو خدا اور رسول کی مرضی سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ ہر شہری اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتا ہے۔

دولت پر سب کا حق

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسلامی انقلاب اس بات کو برداشت نہیں کرتا کہ ایک طرف تو دولت کی بے انتہا فراوانی اور دوسری طرف یکسر محرومی پائی جائے۔ ایسے حالات اگر پیدا ہو جائیں تو صاحبِ امر کو مشاورت سے مناسب اقدامات کرنے ہوں گے۔ خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بنی نضیر کی اراضی کو تمام تر صرف غریب مہاجرین میں ہی تقسیم کر دیا تھا تاکہ اسلامی معاشرہ میں توازن پیدا ہو سکے اور دولت صرف امرا ہی کے درمیان نہ گردش کرتی رہے۔

معاوضے صلاحیت اور ضرورت کے مطابق

ریاست کے ملازمین کی تنخواہوں کو مقرر کرتے وقت بھی ہر شخص کی صلاحیتِ کار اور فنی مہارت کے ساتھ ساتھ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق، کے اصول کو بھی پیشِ نظر رکھنا لازم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت کو تقسیم کرتے وقت غیر شادی شدہ کو ایک حصہ اور شادی شدہ مجاہدین کے لیے دو حصے مقرر فرمائے تھے۔ پرائیویٹ ملازمت میں بھی کسی فرد کا گزارہ ملازمت کی بنیادی شرط ہوتا ہے۔ اسلام انسان کی کفالت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے جو معاوضہ فرد کی کفالت نہ کرے وہ غیر منصفانہ ہے، اسے کفالتی معاوضہ ہونا چاہیے۔

محصول بقدرِ استطاعت ٹیکسوں کی وصولی کے متعلق جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پالیسی بنائی تھی اُسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس طرح نافذ کیا کہ محصلین کو ہدایت کی کہ جب تم لوگوں کے پاس جاؤ تو ان کے گرمی یا جاڑے کے کپڑے یا کھانے کی چیزیں یا سواری کا جانور ہرگز فروخت نہ کرنا۔ وصولی کی خاطر کسی کو ایک کوڑا بھی نہ مارنا۔ نہ کسی کو ایک پاؤں پر کھڑا کرنا چاہے کتنا ہی خراج کیوں نہ باقی ہو کیونکہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے ان کی ضروریات سے فاضل مال ہی وصول کریں۔ اس سے ٹیکسوں کے عاید کرنے اور وصول کرنے کے لیے اسلامی ریاست کی محصول کی پالیسی بالکل واضح ہو جاتی ہے جو استطاعت اور عدم استطاعت کی مناسبت کے اُصول پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے کہ حضور جو رحمت للعالمین تھے وہ لوگوں کے لیے رحمت کا پیغام ہی لائے تھے اس لیے اسلامی ریاست لوگوں کی بنیادی ضروریات کو نظرانداز کر کے کوئی ٹیکس وصول نہیں کرسکتی۔

حرام سب کے لیے حرام جن چیزوں کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے مثلاً سُود، جُوا، شراب اور دوسری منشیات۔ وہ ریاست کے لیے بھی اسی طرح حرام ہیں جس طرح افراد کے لیے حرام ہیں ان کی پیدائش، تجارت، ٹھیکے وغیرہ سب ناجائز اور حرام ہیں اور اسلامی ریاست کو انہیں آمدنی کا ذریعہ بنانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کسبِ معاش میں اسلام انسانی محنت کو قابلِ قدر سمجھتا ہے اور اس کو کسی حالت میں بھی ضائع نہیں ہونے دینا چاہتا۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان آخر دم تک اپنا بھرپور کردار ادا کرتا رہے اور اس کی قوتِ کار ضائع نہ ہونے پائے اور وہ اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرہ دونوں کے لیے آخری دم تک مفید اور کارآمد رہے۔

اِن چند اشارات کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے برپا کردہ اسلامی انقلاب کے متوازن، منصفانہ اور معتدل معاشی نظام کی ایک جھلک ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ درحقیقت سارا معاشی نظام فرد کی امداد وکفالت کے اُصول پر قائم کیا گیا ہے یہی سبب ہے کہ اس نظامِ معاش کو چلتے ہوئے ابھی چند سال بھی نہ گذرے تھے کہ زکوٰۃ وصول کرنے والے حاجت مندوں کی دستیابی دشوار ہو گئی تھی اور معاشرے میں کہیں کوئی حاجت مند دکھائی نہ دیتا تھا۔

(باقی برصفحہ ۵۶)

وسطی ایشیا میں اسلام

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی - پشاور یونیورسٹی

بعض مؤرخین کے نزدیک اسلام وسط ایشیا میں اٹھارویں سال ہجری میں داخل ہوا لیکن مستند روایت کے مطابق اسلام وسط ایشیا میں ۲۱ ہجری میں داخل ہوا[1] اس کی وجہ یہ تھی کہ ۲۱ھ تک حضرت عمرؓ نے ایران فتح کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اس وقت تک مسلمانوں کی جنگیں دفاعی تھیں اور اپنے ملک کی حفاظت کے لیے تھیں۔ حضرت عمرؓ کا اپنا تاثر ایران کے بارے میں یہ تھا کہ کاش! ہمارے اور ایران والوں کے درمیان آگ کا پہاڑ ہوتا تاکہ نہ ہم ان پر حملہ کر سکتے اور نہ وہ ہم پر حملہ آور ہوتے[2] لیکن ایرانیوں نے مسلمانوں کو آرام سے نہیں رہنے دیا۔ اور انہوں نے مسلمانوں کا ناک میں دم کر دیا۔ اس بارے میں بزرگ صحابہ کی رائے یہ تھی کہ ایران والوں کی ساری غداریوں کی جڑ وہاں پر یزدجرد کا وجود ہے۔ ایرانیوں کو جب تک یہ معلوم ہے کہ ایران کے تخت کا وارث موجود ہے اس وقت تک وہ مسلمانوں کے خلاف لڑنے سے باز نہیں آئیں گے[3] اس بنیاد پر حضرت عمرؓ نے عام لشکر کشی کا ارادہ کیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے بہت سارے جھنڈے

---

[1] تاریخ طبری - ۱۸ ہجری - تاریخ اسلام، حضرت عمر فاروق۔

[2] شبلی نعمانی - الفاروق، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ص ۲۰۲

[3] ایضاً۔

تیار کیے اور الگ الگ ملکوں کے لیے الگ الگ مشہور سرداروں کو علم عطا کیے۔ خراسان کا جھنڈا احنف بن قیس کے پاس بھیجا، سابور اور اردشیر کا جھنڈا مجاشع بن مسعود کو دیا۔ اسطخر کا جھنڈا عثمان بن العاص الثقفی کو دیا۔ فسا کا ساریۃ الکنانی کو، کرمان کا سہیل بن عدی کو، سیستان کا عاصم بن عمرو کو، مکران کا حکم بن عمیر التغلبی کو اور آذربائیجان کا عتبہ کو دیا۔[1] ۲۱ھ کو یہ سارے علم اپنے اپنے مقام پر پہنچے۔ ان کو یہ نصیحت کی گئی تھی کہ حملہ کرنے سے پہلے وہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں۔ اگر انھوں نے اسلام قبول کر لیا تو پھر ان میں اور دوسرے مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ ان کے سامنے یہ تعلیمات موجود تھیں کہ جنھوں نے کلمہ پڑھا ان کے مال اور جانیں محفوظ ہوں گی، اور اگر انھوں نے اسلام قبول نہ کیا تو پھر ان کو کہہ دیں کہ وہ اپنے علاقے مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔ اور خود اپنے دین پر قائم رہیں اور جزیہ دیتے رہیں اور اگر وہ اس کے لیے بھی تیار نہ ہوں تو پھر ان کے خلاف تلواریں بے نیام کر دیں۔[2] اس طرح مسلمانوں نے اصفہان، ہمدان، رے، آذربائیجان، موقان اور جیلان فتح کیے۔[3]

۲۲ھ میں طبرستان فتح ہوا۔ اس طرح آرمینیہ، سابور، اردشیر، توج اور اصطخر باری باری فتح ہوئے۔ اس کے بعد فسا، دارابجرد، گازرون، ارجان اور شیراز بھی یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔[4]

۲۳ھ میں کرمان، سیستان (جس کا دوسرا نام زرنج ہے) اور خراسان فتح ہوئے۔ کہتے ہیں کہ اس وقت ماوراءالنہر، فرغانہ، خوارزم، طخارستان اور سیستان خراسان میں شامل تھے، ان کے مشہور شہر نیشاپور، مرو، ہرات، طوس اور فسا تھے۔[5]

---

1. شبلی نعمانی - الفاروق - نیشنل بک فاؤنڈیشن ص ۲۰۲
2. احمد امین، فجر الاسلام، بیروت، ۱۹۶۹ء، دسواں ایڈیشن ۸۵
3. الفاروق ۲۰۳ ف ف، تاریخ اسلام ۱۷۶
4. " ۲۰۸ — ۲۱۰ " " ۱۷۷
5. " ۲۱۵ — ۲۱۸ " " ۱۷۷ — ۱۸۰

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کی اشاعت میں فتوحات کا خاصا دخل ہے، کیونکہ ان فتوحات کے نتیجے میں جن لوگوں کو غلام بنایا گیا۔ انہوں نے اسلام کی اشاعت میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ کوفہ کے آدھے سے زیادہ باشندے غلام تھے۔ اور ان کی اکثریت ایرانیوں کی تھی۔ وہ جنگی قیدیوں کی شکل میں کوفہ آئے تھے۔ یہاں رہ کر انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اور ان کے مالکوں نے ان کو آزاد کیا۔ ان فتوحات کے نتیجے میں جزیرۃ العرب میں اہلِ عجم بڑی تعداد میں آئے۔ اگرچہ ان کا شمار عربوں کے مقابلہ میں کم تھا۔ کہتے ہیں کہ ان مفتوحہ ممالک کے اکثر باشندوں نے اسلام قبول کر لیا تھا[1]۔ جلولا جتنا سے یہاں سے [illegible] لونڈیاں قیدی بنائی گئیں۔ اور وہ پھر ساری کی ساری مسلمان ہو گئیں۔

سوس کی فتح کے بعد یہاں کے متعدد بڑے بڑے امراء اور رؤسا نے بطیب خاطر اسلام قبول کیا۔ قادسیہ کے معرکہ کے بعد ایران کا شاہی رسالہ جس میں چار ہزار افراد تھے مسلمان ہو گیا۔ یزدگرد کے مقدمۃ الجیش کا افسر سیاہ کئی ہزار سپاہیوں سمیت مسلمان ہو گیا۔ ان کے اسلام قبول کرنے سے سیابچہ، زط اور اندغار کی کئی قومیں، جو ایرانی فوج میں بھرتی تھیں، مسلمان ہو گئیں[2]۔

دمیاط کی فتح کے بعد قبارہ اور دراذہ سے لے کر عسقلان تک پورے علاقے میں اسلام پھیل گیا۔ شہر فسطاط میں، جو حضرت عمروؓ نے آباد کیا تھا، مسلمانوں کے کئی محلے تھے۔ جب فارس سارا فتح ہو گیا تو پھر یہ ایک اسلامی ولایت بن گئی۔ بے شمار ایرانی عربوں کے ہاتھوں قیدی بن گئے، جنہوں نے بعد میں اسلام قبول کیا۔ ان میں بہت سوں نے عربی زبان سیکھ لی تھی۔ اور ان کی دوسری نسل میں ایسے لوگ موجود تھے جو عربوں کی طرح عربی بول سکتے تھے[3]۔

۱۔ فجر الاسلام، ص ۹۲، ۹۳

۲۔ " " ۱۵، تاریخ اسلام ص ۲۱۹

۳۔ " " ۱۸، " ص ۲۱۹

ان غلاموں نے علمی میدان میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ یہ تابعین کا دور تھا۔ اموی دور میں مشہور عرب علما جیسے سعید بن المسیبؓ، علقمہ، شریح، مسروق، ابراہیم نخعی اکثر غلام تھے۔ مدینہ میں سلمان بن یسار اونچے پائے کے عالم تھے۔ ان کے والد ام المومنین حضرت میمونہؓ کے غلام تھے۔ دوسری طرف نافع تھے، جو عبداللہ بن عمرؓ کے غلام تھے اور ابن عمرؓ نے ان سے بہت سی احادیث کی روایت کی تھی۔ نافع دیلم کے رہنے والے تھے۔ اسی طرح ربیعہ الرائی بھی جو امام مالکؒ کے استاد تھے، غلام ہی تھے۔ محمد بن سیرین میسان کے قیدیوں میں سے تھے۔ ان کی ماں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی کنیز تھیں۔ یہ بصرہ کے فقہا میں سے تھے۔ اسی طرح حسن بصری کے والد بھی میسان کے قیدیوں میں سے تھے۔[1]

مکحول بن عبداللہ، الاوزاعی کے استاد کے باپ ہرات کے رہنے والے تھے۔ ان کی والدہ کابل کے ایک بادشاہ کی لڑکی تھی۔ لیث بن سعد جو مدرسہ مصر کے فارغ التحصیل تھے، یزید بن حبیب کے شاگرد تھے، یہ بھی غلام تھے اور اصفہان سے تعلق رکھتے تھے۔[٥][2]

حضرت عمرؓ نے اشاعت اسلام کے لیے یہ انتظام بھی کیا تھا کہ مفتوحہ علاقوں میں دین اسلام کی تعلیم کے لیے بڑے بڑے علما روانہ کیے تھے۔ انھوں نے دینی علوم کی اشاعت اور تعلیم کے لیے ایک وسیع نظام قائم کیا تھا۔ سارے مفتوحہ علاقوں میں قرآن مجید کے درس شروع کیے۔ اور اس مقصد کے لیے تنخواہ دار معلمین کو مقرر کیا تھا۔ بڑے بڑے صحابہؓ کو قرآن کی تعلیم کے سلسلے میں دور دراز کے علاقوں میں بھیج دیا تھا۔ طالب علموں کو دس دس

---

[1] فجر الاسلام ص ۱۵۳، ۱۵۴

[2] " " ص ۱۵۵، ۱۸۱، ۱۸۳، ۱۹۱۔

٥ یہ حیرت انگیز مثال صرف اسلام ہی نے پیش کی کہ اس کے ہاں جو لوگ جنگی قیدی اور غلام بن کے آئے ان کے لیے معاشرے میں ترقی کی راہیں اس طرح کھلی تھیں کہ وہ علم اور سیاست کے اعلیٰ مدارج تک پہنچے اور اسلام نے ان کا رتبہ بلند تر کر دیا۔ (ادارہ)

کی ٹولیوں میں تقسیم کیا جاتا - ان کے لیے جو نصاب رکھا گیا تھا - اس کے مطابق سورۃ بقرہ سورۃ نساء ، سورۃ مائدہ ، اور سورۃ نور کا پڑھنا ہر مسلمان کے لیے لازمی تھا - بعض کے لیے قرآن مجید کے ابتدائی حصّے لازمی قرار دیئے تھے - اسی طرح امتحان کے لیے ماہرین کو مختلف علاقوں میں بھیجا جاتا - جن لوگوں کو قرآنِ پاک کا کچھ نہ کچھ حصّہ یاد نہ ہوتا ، ان کو سزا دی جاتی[1]

ساسانی خاندان کے آخری بادشاہوں کے عہد میں ملک میں ہولناک بدنظمی کا دَور دورہ تھا - حکومت میں مجوسی لفوذ کر چکے تھے - اور شہنشاہ کی مجلسِ مشاورت میں ان کو بڑا اقتدار اور اختیار حاصل تھا - اور ملک کے نظم ونسق میں بھی اُن کا بڑا حصّہ تھا - اپنے اقتدار سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ ایسی تمام جماعتوں پر ظلم وستم کرتے تھے جن کے مذہبی عقائد اُن سے مختلف تھے - اس لیے ان لوگوں نے عربی فتوحات کو اپنے حق میں نجات کا باعث سمجھا - کیونکہ ان مختلف فرقوں کو ایک ایسی حکومت کے زیرِ سایہ سُکھ کا سانس لینے کی توقع ہوئی جس نے اُن کو جزیہ کی ایک خفیف رقم کے معاوضے میں مذہبی آزادی دی[2]

امام حسینؓ کی شادی یزدگرد کی لڑکی شاہ بانو سے ہوئی تھی - جو ساسانی خاندان کا آخری بادشاہ تھا - امام حسینؓ اور شاہ بانو کی اولاد کو ایرانیوں نے اپنے قدیم بادشاہوں کی وارث اور اپنی قومی روایات کا والی تصوّر کیا اور یہی وہ ملکی جذبہ ہے جس نے ایرانیوں میں حضرت علیؓ کی اَولاد کے ساتھ انتہائی شغف پیدا کیا اور اسلام میں شیعہ فرقہ کی ابتدا اسی شغف سے ہوئی[3]

وسطی ایشیا میں اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں اس بات کا بڑا دخل تھا کہ یہاں کا اصل

---

[1] فجر الاسلام ص ۱۵۲ ، تاریخ اسلام ص ۲۱۵ المفاروق ۲۶۷ ف ف

[2] دعوتِ اسلام ۲۰۹

[3] " ۲۱۱

مذہب مجوسیت تھا، جس کے سربراہ زردشت تھے۔ اس مذہب کے اکثر عقیدے اسلامی عقائد کے ساتھ ملتے جلتے تھے۔ مثلاً اس مذہب میں دنیا و آخرت، جزا و سزا، اعمال کے ریکارڈ، پل صراط، قیامت کا قیام اور انسان کے عدم سے پیدا ہونے وغیرہ کا تصور موجود تھا۔ یہی عقائد اسلام میں بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے زردشتیوں کو اہلِ کتاب کا درجہ دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا: "سنّوا بهم سنة اهل الكتاب" (ان کے ساتھ اہلِ کتاب کی طرح کا معاملہ کرو)۔ عقائد کی اس مماثلت کی وجہ سے اکثر مجوسی مسلمان ہو گئے اور ان میں اسلام بڑی آسانی سے پھیلا۔[1]

اس کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں میں مدرسوں کے قیام اور دین کی تعلیم و تدریس نے اسلام کو ان علاقوں میں اتنا مضبوط کیا کہ آج تک اس کے پاؤں وہاں جمے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نظام الملک طوسی پہلے آدمی ہیں جنہوں نے بغداد، نیسا پور، ہرات، اصفہان، بصرہ، مرو، کرمل، طبرستان اور موصل میں دینی مدارس قائم کیے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نیسا پور کا مدرسہ بیہقیہ نظام کی پیدائش سے پہلے وجود میں آیا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ نیسا پور میں دوسرا مدرسہ سعیدیہ نصر بن سبکتگین نے قائم کیا تھا۔ ایک دوسرے قول کے مطابق دینی مدارس کا قیام ۴۰۰ھ کے بعد عمل میں آیا تھا۔ اور سب سے پہلا مدرسہ نیسا پور کا مدرسۂ بیہقیہ تھا۔ بہر حال یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ صحابہ اور تابعین کے زمانے میں مصر، مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ اور شام میں مدارس موجود تھے جن کے بڑے بڑے غیر عرب تابعین علماء فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی وسط ایشیا میں ابتدا ہی سے مدارس کا قیام عمل میں آنا کوئی بعید از فہم بات نہیں ہے۔[2]

اشاعتِ اسلام کی ایک اور وجہ عبد الملک کے دور میں عربی زبان کی ترویج بحیثیت سرکاری

---

[1] فجر الاسلام، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴

نوٹ: آرنلڈ نے اس روایت کو قولِ رسولؐ شمار کیا ہے، جو درست نہیں ہے۔ یہ حضرت عمرؓ کا قول ہے۔

[2] احمد امین ضحی الاسلام، دوسری جلد، تاریخ طباعت نامعلوم، ۴۹، ۵۰۔

زبان اور اسلامی سکے کا اجرا بھی تھا۔ دونوں باتوں نے اشاعتِ اسلام میں نمایاں کردار ادا کیا[1]۔
وسط ایشیا میں اشاعتِ اسلام کا ایک اور سبب یہ بھی تھا کہ جو علاقے فتح کیے جاتے تھے وہاں ابتدا ہی میں لازماً مساجد تعمیر کی جاتی تھیں۔ جہاں باقاعدہ خطبہ دیا جاتا تھا۔ یہ مساجد سب سے بڑی درس گاہیں بھی ہوتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ فَقَدْ كَانَ الْمَسْجِدُ اَهَمَّ لِلثَّقَافَةِ فِي الْأُمَمِ الْإِسْلَامِيَّةِ (مسجد اسلامی ممالک میں ثقافت کا ایک اہم مرکز تھی)[2] ان مساجد اور مدارس کے ذریعے اشاعتِ اسلام کے جو کارنامے انجام پائے وہ سب ہمارے سامنے ہیں۔ دینِ اسلام کے بنیادی مآخذ قرآن اور سنت ہیں اور ان دونوں کی تدوین حقیقت میں وسط ایشیا میں ہوئی۔ اگرچہ یہ عرب میں پیدا ہوئے۔ مثلاً[3] امام بخاری نے، جن کے دادا مغیرہ نے والیٔ بخارا کے ہاتھوں اسلام قبول کیا تھا، خدا کی کتاب قرآن کے بعد سب سے زیادہ مستند کتاب صحیح البخاری تصنیف کی۔ اس خدمت میں انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ یعنی سولہ سال صرف کیے اور جس کے لیے انھوں نے دور دراز کے سفر کیے۔ اسی طرح صحیح مسلم کے مصنف مسلم بن الحجاج نیساپور کے رہنے والے تھے۔ بخاری کے بعد یہ دوسری مستند ترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، سنن دارمی اور بیہقی کی کتاب السنن الکبریٰ بھی اس سلسلے میں شامل ہیں۔ الغرض احادیث کی اکثر صحیح اور مستند ترین کتابوں کے مؤلفین اسی مٹی سے جنم لے چکے ہیں۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے مفسرین اور علما جیسے طبری، رازی، ابوبکر الجصاص، ابوالحسن قدوری، مرغینانی، ابواللیث سمرقندی، اصبہانی، سرخسی، فارابی، کاسانی، ابیوردی، تاشانی، شاشی، نیساپوری، مروزی وغیرہ وہ علما و فضلا ہیں، جن کو وسط ایشیا کی سرزمین نے جنم دیا ہے۔ (باقی)

۱۔ تاریخ اسلام، جلد دوم، بنی امیہ، ۱۲۵۔
۲۔ دیکھیے مسجد، اردو دائرۃ المعارف میں۔ ایضاً ضحی الاسلام، دوسری جلد، ۴۳، [illegible]
۳۔ ضحی الاسلام، دوسری جلد، ۷۰، ۷۱، ۱۱۰، ۲۶۳-۲۶۹۔

صراطِ مستقیم

جناب محمد یعقوب صاحب ۔ شعبۂ جغرافیہ، پشاور یونیورسٹی

قرآنِ پاک جس راستے کا داعی ہے اس کا نام قرآن ہی نے صراطِ مستقیم رکھا ہے ۔۔ صراطِ مستقیم کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ تمام مفسرین کے مطابق سورۂ فاتحہ قرآن مجید کی اہم ترین سورۃ ہے ۔ اس سورۃ میں دینے والا خود مانگنے کا طریقہ سکھاتا ہے مکمل سورۃ میں جو دُعا مرکزی اہمیت رکھتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ: "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" ۔ اور مالکِ کائنات اس مختصر سی دُعا کے جواب میں مکمل قرآنِ حکیم عطا فرماتا ہے اور ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۔

اس راستے کی تلاش انسانی فطرت کا تقاضا ہے ۔ تمام انبیاء اس راستے پر چلتے اور اس کی دعوت دیتے رہے ہے ۔

غلط اور ٹیڑھے راستے تو بہت سے ہیں، مگر سیدھا راستہ صرف ایک ہے ۔ سورۂ نحل کی آیت نمبر ۹ میں ارشادِ ربانی ہے کہ "یہ اللہ کے ذمے ہے کہ وہ سیدھا راستہ بتائے اور ٹیڑھے راستے بہت ہیں ۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صراطِ مستقیم کی جو تشریح فرمائی ہے ۔ اس کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے ہمارے سامنے ایک سیدھا خط کھینچا، پھر اس خط کے داہنے بائیں دوسرے خط کھینچے اور فرمایا کہ داہنے بائیں کے یہ خطوط وہ طریقے ہیں جو شیاطین نے ایجاد کئے ہیں اور ان میں سے ہر راستہ پر

ایک شیطان مسلط ہے جو لوگوں کو اس طرف چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ پھر سیدھے خط کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: یہ میرا راستہ ہے (یعنی صراطِ مستقیم) تم اس کا اتباع کرو۔

صراطِ مستقیم کی پہچان اس راستے کو پہچان لینا سب سے بڑا علم اور سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اسی کو نہ پہچاننے کی وجہ سے افراد اور قومیں گمراہ ہوئیں، ورنہ خداطلبی اور مجاہدات کی توجہت سے اہلِ کفر و ضلالت میں بھی کمی نہ تھی۔ اس لیے قرآن پاک نے پوری وضاحت کے ساتھ صراطِ مستقیم کا مطلب سمجھا دیا ہے اور اعلان بھی کر دیا ہے کہ "ہم نے اسے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے آسان کر دیا ہے، پھر ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟" صراطِ مستقیم کی تعریف صرف ایک ہے اور یہ لفظ اتنا عام فہم ہے کہ ہر زبان میں اس کا بالکل ہم معنی لفظ موجود ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مطابق اللہ کے عالمگیر دین کی حقیقت ظاہر کرنے کے لیے صراطِ مستقیم سے بہتر کوئی تعبیر نہیں ہو سکتی تھی۔ اس راستے کی اہمیت کے پیش نظر یہ ضروری تھا کہ اس کے نقوش اور سنگ ہائے میل پوری طرح معلوم ہوں اور یہ بھی معلوم ہو کہ مسافر کو کس قسم کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور اس کے مخالفین کس قسم کی خصوصیات اور ہتھیاروں سے مسلح ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں کہ تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں؟ — یہ کہ (۱) اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اور (۲) والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اور (۳) اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو — ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔ اور (۴) بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی۔ اور (۵) کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے، ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ — یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔ اور (۶) یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو۔ یہاں تک کہ وہ رشد کو پہنچ جائے اور (۷) ناپ تول میں پورا انصاف کرو۔ ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بوجھ رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہو۔ اور (۸) جب

بات کہو انصاف کی کہو، خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار کا ہی کیوں نہ ہو۔ اور (۹)
اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تم کو کی ہے۔ شاید کہ تم
نصیحت قبول کرو۔ نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا راستہ ہے، لہٰذا تم
اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں
پراگندہ کر دیں گے۔ یہ وہ ہدایت ہے جو تیرے رب نے تم کو دی ہے شاید
کہ تم کج روی سے بچو۔" ۶: ۱۵۱ — ۱۵۳ ۔

قرآن پاک نے کمال مہارت سے صراطِ مستقیم کی وضاحت اس طرح فرمائی جیسے ایک اچھا استاد بچوں کو پہلے آسان زبان میں ایک چیز کا مطلب سمجھاتا ہے اور پھر اسی کے مطابق عمل کر کے انہیں دکھاتا ہے۔ غور کریں کہ صراط مستقیم کے تعین کے لیے یہ نہیں فرمایا کہ یہ صراط قرآن یا صراطِ رسولؐ ہے، حالانکہ سارا قرآن اسی صراط مستقیم کی تشریح ہے اور سنّت رسولؐ اس کی تفصیل۔ مگر اس راستے کا تعین کرنے کے لیے ایجابی اور سلبی پہلوؤں سے وضاحت کر دی۔ چنانچہ فرمایا "یہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر انعام کیا گیا"۔ یعنی انعام یافتہ لوگوں کے نقشِ قدم پر چلو تو خود ہی صراطِ مستقیم پا لو گے۔ صرف اور محض قرآن سے انسان از خود اپنی پوری پوری تربیت کے لیے رہنمائی اخذ نہیں کر سکتا۔ اگر خالی قرآن سے سارا کام چل جاتا تو نبی کی ضرورت نہ ہوتی۔ اسی طرح سلسلۂ رسالت بھی حضور اکرمؐ پر ختم ہو گیا۔ اب تو کوئی رسول آنا ہی نہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کی نشان دہی ضروری ہے جو ہر زمانے میں موجود ہوں۔ ایسے لوگوں کا ذکر بار بار قرآن میں آیا ہے۔ اور ان کی زندگیوں کے لازمی پہلوؤں کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔ ان کے اعمال کا مفصل ذکر ہے اور ان کے بدلے میں جن انعامات سے ایسے لوگوں کو نوازا گیا اور جن انعامات کا ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے، ان کی تفصیل بھی موجود ہے۔ ایک مقام پر انعام یافتہ لوگوں کا تعین اس طرح کیا گیا ہے "اور جس کسی نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی، بلاشبہ وہ ان لوگوں کا ساتھی ہوا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے"۔ ان لوگوں کی راہ پر ہی چلنے کے لیے صراطِ مستقیم کی دعا کے ساتھ ہی بندہ اپنے رب سے دعا مانگتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ مجھے ایسے

لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تو نے انعام کیا۔ ایک مقام پر فرمایا: "اور جس نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی تو بلاشبہ وہ ان لوگوں کا ساتھی ہوا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے۔ یہ انعام یافتہ راہ نبیوں کی، صدیقین کی، شہدا اور نیک عمل انسانوں کی ہے۔ اور کیا اچھی ان کی رفاقت ہے"۔ تو معلوم ہوا کہ اطاعت تو اللہ ہی کی کرنی ہے، مگر اس طریقے سے کرنی ہے جس طرح انبیاء، صدیقین، شہداء اور نیک عمل انسانوں نے کی۔

نبی کی پہچان تو آسان ہے کیونکہ اس کا رابطہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے اور جہاں مناسب ہو، اُسے نشانیاں اور معجزے بھی عطا ہو جاتے ہیں تاکہ لوگ اُسے پہچان لیں۔ جن لوگوں نے انبیاء پر ایمان نہیں لایا اُس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انھوں نے انبیاء کو پہچانا نہیں، بلکہ مادی نقصانات اور تعصبات مانع رہے۔ یہ نقصانات ناجائز حاصل کردہ اقتدار اور مفادات و تعیش کے تھے۔ جو نبی کی پیروی کرنے سے چھوڑنے پڑتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ انبیاء کی مخالفت باختیار، برسرِاقتدار اور دولت مند لوگوں نے ہی کی ہے اور ان کے اوّلین پیرو عموماً وہی لوگ رہے ہیں جن کا گمراہ معاشروں میں کوئی مقام نہ تھا۔ آج بھی دنیا میں احیائے دین کی تحریکیں جہاں کہیں چل رہی ہیں، انھیں ایسی ہی مشکلات کا سامنا ہے۔ نبی کے صراطِ مستقیم پر ہونے کی سند اللہ تعالیٰ نے خود ہی دی ہے۔ لہٰذا اس کے پیرو یقیناً صراطِ مستقیم پر ہوتے ہیں۔ خاتم النبیین کی بعثت کے بعد صرف آپؐ والا راستہ ہی اللہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے۔ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر موسٰیؑ بھی ہوتے تو وہ بھی میری ہی پیروی کرتے۔ نبی اکرمؐ کی صراطِ مستقیم پر ہونے کی یقین دہانی اللہ تعالیٰ نے سورۂ یٰسٓ میں ان الفاظ میں فرمائی ہے: "قسم ہے قرآنِ حکیم کی کہ تم رسولوں میں سے ہو اور صراطِ مستقیم پر ہو"۔ اس سے واضح ہوا کہ بالکل یقینی صحیح راستہ نبی اکرمؐ والا ہی ہے۔ اور اس کی بنیادی وجہ بھی ایک آیت سے معلوم ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ آپؐ سے فرماتے ہیں: "تم اس کتاب کو مضبوطی سے تھامے رکھو، جو تم پر وحی کی گئی ہے" (۴۳:۴۳)۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ تک رسول اللہ کو بھی اپنی مرضی سے کوئی راستہ ایجاد کرنے کی اجازت نہیں، کجا کے لوگوں کے خود ساختہ راستے، مراقبے یا

چلتے وغیرہ جن کی تصدیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے۔
ارشاد ربانی ہے: ”اور وہ جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہداء ہیں۔ ان کے لیے اُن کا اجر اور ان کا نور ہے“۔ ۵۷:۱۹- مفسرین کے مطابق یہاں ایمان لانے والوں سے مراد وہ صادق الایمان لوگ ہیں جو ہر آزمائش میں پورے اُتریں اور جس قربانی کا تقاضا بھی ایمان کرے بخوشی پیش کر دیں۔ صدیق، صادق کا مبالغہ ہے، یعنی نہایت ہی سچا، جس میں ایمان، تصدیق اور پابندی واطاعت مکمل درجہ کی ہو۔ اور جو ایک خالص سچے، مطابقِ حقیقت قول کو صدقِ دل سے مانتے اور عمل سے اس کا ثبوت بھی دے۔ ایسا صادق الوعد سچا دوست جو آزمائش کے موقع پر دوستی کا حق ادا کر دے، اور جس کا عمل اُس کے قول کے مطابق ہو۔ جو صرف حق اور صداقت کا ہی ساتھ دے، جس سے توقع ہی نہ کی جا سکتی ہو کہ وہ اپنے قول سے ہٹے گا۔ اور جس چیز کو حق وصداقت کے خلاف پائے گا اس کے مقابلہ میں ڈٹ جائے گا۔ صدیقیت کا معیاری نمونہ حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ سیدنا صدیق اکبر نہ ہوتے تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا مفہوم اُمت پر پوری طرح واضح نہ ہوا ہوتا۔ آپؓ کی ساری زندگی جس میں اسلام سے پہلے کا دور بھی شامل ہے۔ گواہی دیتی ہے کہ آپ فطرتِ سلیمہ کے مالک تھے۔ دورِ جاہلیت میں بھی نیک عمل تھے۔ شراب، شرک اور دوسرے گناہوں سے بچتے تھے۔ بہ طورِ خاص آپ کو نبی اکرمؐ کی رفاقت کا شرف نبوت سے پہلے بھی حاصل تھا، کیونکہ ”کند ہم جنس باہم جنس پرواز“۔ قابلِ ذکر ہیں۔ وہ الفاظ جو قریش کے ایک سردار ابو الدغنہ نے صدیق اکبر کے بارے میں کہے۔ جب ابوبکر صدیقؓ مکے والوں کے ستانے سے تنگ آ گئے تو اکیلے حبشہ کی طرف ہجرت کے لیے روانہ ہو گئے۔ کئی دنوں کی مسافت طے کرنے کے بعد ابو الدغنہ آپ کو راستے میں مل گئے اور پوچھا کہ اے ابوبکر! کہاں جا رہے ہو؟ آپ نے جواب دیا کہ تیری قوم مجھ کو رہنے نہیں دیتی، چاہتا ہوں کہ الگ کہیں جا کر خدا کی عبادت کروں اس لیے مکے کو چھوڑ رہا ہوں۔ ابو الدغنہ نے کہا کہ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ تم جیسا آدمی مکہ سے نکل جائے۔ میں تم کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں۔ وہ آپ کو واپس لے آئے اور مکہ کے

تمام قبیلوں کے سرداروں کو بلا کر کہا کہ ایسے شخص کو نکالتے ہو جو مہمان نواز ہے مفلسوں کا مددگار ہے رشتہ داروں کو پالتا ہے اور مصیبتوں میں کام آتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ قریب قریب یہی الفاظ ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے رسول اکرمؐ کے بارے میں فرماتے تھے، جب آپ پہلی وحی کے موقع پر خوف زدہ ہو کر غارِ حرا سے گھر تشریف لائے۔ بہرکیف سردارانِ قریش نے ابوالدغنہ سے کہا کہ شرط یہ ہے کہ ابوبکرؓ نمازوں میں چپکے چپکے جو چاہیں پڑھیں، جہر سے قرآن پڑھتے ہیں تو ہماری عورتوں اور بچوں پر اثر ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر نے چند روز تو یہ پابندی کی، لیکن آخر اپنے گھر کے پاس ایک مسجد بنالی اور اس میں خشوع و خضوع کے ساتھ بآوازِ بلند قرآن پڑھنے لگے۔ آپ نہایت رقیق القلب تھے، قرآن پڑھتے تو بے اختیار روتے۔ عورتیں اور بچے آپ کو دیکھتے تو متاثر ہوتے۔ قریش نے ابوالدغنہ سے شکایت کی۔ اُس نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ اب میں تمہاری حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو خدا کی حفاظت بس ہے۔ جناب صدیق اکبرؓ نے اطاعتِ رسولؐ کو اس طرح اپنا مقصدِ زندگی بنایا کہ آپ کا ہر عمل بار بار ذکر کے قابل ہے تاکہ ایمان تازہ ہو اور صراطِ مستقیم کی شاہ راہ کی حدیں واضح رہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے اتباعِ رسولؐ کو علامہ اقبال یوں بیان کرتے ہیں ؎

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس — صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

اقبال ہی کے الفاظ میں ابوبکرؓ "ثانیِ اسلام و غار و بدر و قبر" کا مقام رکھتے ہیں۔ یہ مقام خاص جناب صدیق اکبرؓ کا ہے، کسی اور کا نہیں! سرکارِ رسالت مآبؐ فرماتے ہیں۔ "میں نے جس کو بھی اسلام کی دعوت دی اُس نے کچھ نہ کچھ حجت کی، صرف حضرت ابوبکرؓ نے بغیر کسی پس و پیش کے دعوت قبول کی۔" آپ کا یہ ارشاد مبارک بھی ہے کہ "میں نے ہر ایک کے احسانات کا بدلہ دُنیا ہی میں دے دیا۔ مگر ابوبکر صدیق کے احسانات کا بدلہ یہاں پورا نہیں ہوا۔" حضرت ابوبکرؓ ہر وقت اپنا سب کچھ رسولِ خدا کے معمولی اشارے پر لُٹا دینے کے لیے تیار رہتے۔ موقع کے مطابق جس چیز کی ضرورت ہوتی آپ کی طرف سے پیش کر دی جاتی۔ اور جو عمل بھی مطلوب ہوتا برضا و رغبت کر دیا جاتا۔ آپ کی

نیکیوں کا کیا شمار کہ حضرت عمر فاروقؓ (جن کے بارے میں ارشاد نبویؐ ہے کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے) کا فرمان ہے کہ ابوبکرؓ کی ایک غارِ ثور کی رات کی نیکی میری تمام عمر کی نیکیوں کے برابر ہے۔ یہ فضائل اور یہ مقام جن وجوہات کی بنا پر صدیق اکبرؓ کو حاصل تھا۔ ان کے بارے میں ارشادِ نبویؐ ہے کہ:

" ابوبکر کو کثرت صلوٰت کی بنا پر تم (صحابہ کرام) پر فضیلت نہیں، بلکہ اس سر کے سبب ہے جو اُن کے سینے میں قرار پائے "

حضرت ابوبکرؓ صدیق نے نبی اکرمؐ کے انتقال کے بعد بڑے نازک حالات میں دین کو بعد میں آنے والوں تک بالکل اسی حالت میں منتقل کیا جس حالت میں نبی اکرمؐ چھوڑ گئے تھے۔ آپ نے اپنی قربانیوں اور فہم و فراست کی بنا پر صراطِ مستقیم میں کوئی خم نہ آنے دیا۔ آپ کا ہر عمل قرآن و سنت کے مطابق تھا۔ تجارت کی، مال کمایا، اللہ کی راہ میں خرچ کیا، خلافت بھی کی، مگر جو کام کیا ایسا کیا کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ آپ کی ساری زندگی گواہ ہے کہ انبیاء کے بعد افضل ترین مقام کے حقدار آپ ہی ہیں۔ مشاورت بھی کی، مگر نازک ترین حالات میں مشاورت کے خلاف بھی عمل کیا[1]۔ کیونکہ جناب صدیقؓ کے نقطۂ نظر سے قرآن و سنت کا تقاضا دوسرا تھا۔ آپ عرب کے امیر ترین تاجروں میں سے تھے۔ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر اتباعِ رسولؐ کی راہ میں قربان کر دیا۔ اور جب آخری وقت قریب آیا تو اہل خانہ سے کہا کہ گھر کا سامان فروخت کر کے جتنا وظیفہ خلافت کے دوران

---

[1] یہ رائے صاحب مضمون کی ہے۔ اور سلف سے کئی بزرگوں نے اسی کو اختیار کیا ہے، مگر دوسری رائے اسی وزن کی یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف سے دو ایک مشاورتوں میں جوش و جذبہ کے ساتھ جو اختلافی اظہارِ رائے ہوا اُس میں استدلال بھی شامل تھا۔ اور اہل شوریٰ اس سے متاثر ہو کر آپ کے ہم نوا بن گئے۔ نہ یہ کہ اہلِ شوریٰ دوسری رائے پر قائم رہے ہوں۔ اور جناب صدیق نے اپنی مرضی سے کام کر دیا ہو۔

(ن ۔ ر ۔ ص)

بیت المال سے ملا ہے وہ لوٹا دیا جائے ۔ ایسا ہی کیا گیا اور آخر میں اتنا کچھ نہ بچا کہ آپ کو کفن دفن کا انتظام ہو جاتا ۔ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ ابو بکرؓ آپ نے ثابت کر دیا کہ منصبِ خلافتِ رسولؐ کے حق دار آپ ہی تھے ۔ اور آپ نے بعد میں آنے والوں کے لیے کام مشکل کر دیا ۔ یعنی آپ کے بعد جو بھی آپ کا جانشین ہوگا اُسے آپ کے نقشِ قدم پر ہی چلنا ہوگا ۔ تو یہ ہیں صدیقین کی صفات جن کی تقلید اتباعِ نبی سے مطابقت رکھتی ہے ایسی ہی ہستیاں صراطِ مستقیم کے مسافروں کی رہنمائی کر سکتی ہیں ۔ ایسے حضرات صراطِ مستقیم کے خدوخال کو سمجھتے ہیں اور سچائی کے سانچے میں ایسے ڈھل گئے ہوتے ہیں کہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی بات اُن کے دماغ میں اُتر ہی نہیں سکتی ۔

اس کے بعد شہید کے صراطِ مستقیم پر ہونے کی تصدیق ربِ غفور نے خود فرمائی ہے ۔ شہید کا لفظ قرآنِ حکیم میں گواہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے ایمان کی صداقت پر زندگی کے پورے طرزِ عمل سے شہادت دے ۔ اللہ کی راہ میں جان دینے والے کو بھی شہید اس لیے کہتے ہیں کہ وہ جان دے کر ثابت کرتا ہے کہ جس چیز پر وہ ایمان لایا ہے اُسے سچے دل سے حق سمجھتا ہے اور اس کے لیے جان کی قربانی دینے سے بھی اس نے دریغ نہیں کیا ۔ ایسے لوگوں کو بھی شہید کہا جاتا ہے جو اس قدر قابلِ اعتماد ہوں کہ جس بات پر وہ شہادت دے دیں اس کا برحق ہونا بلا تامل تسلیم کر لیا جائے ۔ ہر سچا مومن شہید ہے ۔ کیونکہ اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ دینِ حق پر بوقت ضرورت جان بھی قربان کر دے گا اور پھر بھی بقول اقبال صدا یہی آئے گی کہ "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" ہر مومن کے شہید کے مقام پر فائز ہونے کے حق میں قرآن پاک میں ایک سے زیادہ دفعہ ارشاد ہوا ہے ۔ مثلاً : لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۔ شہید ہونے کے لیے قتل ہو جانا ضروری نہیں ہے ۔ کیونکہ یہ انسان کے اختیار سے خارج ہے ۔

جناب حضرت اسماعیلؑ بھی بغیر ذبح ہوئے ذبیح اللہ بنے ۔ اور رب نے خود فرمایا کہ اے ابراہیمؑ تم نے خواب کو سچا کر دکھایا ۔ اور قربانی کو ایسی قبولیت نصیب ہوئی کہ قیامت تک دُنیا کے کونے کونے میں اس کی یاد تازہ کی جاتی رہے گی ۔ اپنی تمام تر ہستی ، تمام زندگی اور

تمام قوتوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے پیش کر دینا ہی انسان کے اختیار میں ہے اور یہی مطلب لفظِ مسلم کا ہے اور ایسا شخص یقیناً صراط مستقیم پر ہے۔

آخر میں صراطِ مستقیم پر رہنمائی کرنے والوں کو قرآن نے صالحین کہا ہے۔ صالحین وہ نیکوکار انسان ہیں جو نیکی کی سیدھی اور فطری راہ پر استقامت سے قائم رہیں۔ جو اپنے خیالات و عقائد، نیت اور ارادوں اور اقوال و افعال میں راہِ راست پر قائم رہیں۔ تمام برائی کے راستوں سے کنارہ کش رہیں۔ یہ مقام فقط محدود نوعیت کے ذکر و اذکار ہی سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ پوری خدا پرستی سے حاصل ہوتا ہے۔ جہاں اللہ نے کسی عمل کے کرنے کا حکم دیا ہے وہاں اُسے کرنا نیکی ہے اور جہاں وہی عمل نہ کرنے کا حکم دیا ہے، وہاں اُسے ترک کرنا نیکی ہے۔ بلکہ نیکی کا اصل تقاضا یہ کوشش کرنا ہے کہ کسی ممنوعہ عمل کو کوئی دوسرا بھی نہ کرے۔ پھر نیک اعمال یعنی معروف کے بھی درجات اور ترجیحات ہیں۔ مسجد میں باجماعت نماز پڑھنا گھر میں نماز ادا کرنے کے مقابلے میں یقیناً بڑی نیکی ہے۔ رزق حلال کے لیے جائز طریقے سے سعی کرنا، قرآن سیکھنا اور سکھانا، نوافل پڑھنا اور اللہ کے ذکر میں مشغول رہنا نیکی کے کام ہیں۔ مگر نہی عن المنکر اور جہاد کی پکار آجائے تو قرآن و حدیث کا فہم رکھنے والا ہر مسلمان یہ جانتا ہے کہ ایسے موقع پر مقدم عمل کون سا ہوگا۔ یہاں پر تو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی سنّت یہی ہے کہ جہاد کی پکار پر لبیک کہہ کر اپنا سب کچھ پیش کر دیا جائے اور یہی مطلب لفظِ مسلم کا ہے۔ ایک صالح انسان کی ترجیحات موقع محل کے لحاظ سے اللہ کے احکامات کے مطابق ہوں گی۔ نفل نمازوں، ــــــ نفلی روزوں اور صدقات و خدمات بھی ضروری اور مفید ہیں، مگر ان سب سے بڑی نیکی دوسرے انسانوں کو جہنم کی آگ سے بچانے اور نیکی کے کاموں میں تعاون اور بدی کا مقابلہ کرنے میں ہے۔ کیونکہ فرمانِ ربّ ہے:۔

"اور دیکھو نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنا منہ مغرب یا مشرق کی طرف پھیر لیا، نیکی کا وسیع تصور تو یہ ہے کہ انسان اللہ پر، آخرت پر، ملائکہ پر، تمام کتابوں پر، تمام انبیاء پر ایمان لاتا ہے اور اپنا مال خدا کی محبت کی راہ میں

رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیتا ہے اور غلاموں کو آزاد کرنے میں صرف کرتا ہے، نماز قائم کرتا ہے، زکوٰۃ دیتا ہے، قول و قرار کا پکا ہے، تنگی یا مصیبت کی گھڑی ہو یا خوف و ہراس کا وقت ہو، ہر حالت میں ثابت قدم رہتا ہے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو سچے ہیں۔ اور یہی ہیں جو برائیوں سے بچنے والے ہیں۔" (۲۰ : ۱۷۷)

پھر دوسری جگہ یوں ارشاد ہوتا ہے۔

"کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجدِ حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھہرا لیا، جو ایمان لایا اللہ پر اور روزِ آخرت پر، اور جس نے جدوجہد کی اللہ کی راہ میں۔ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ اور اللہ ظالموں کی راہنمائی نہیں کرتا۔ اللہ کے ہاں تو انہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا وہی کامیاب ہیں۔ ان کا رب انہیں اپنی رحمت اور خوشنودی اور جنتوں کی بشارت دیتا ہے۔ جہاں ان کے لیے پائدار عیش کے سامان ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یقیناً اللہ کے پاس صلہ دینے کا بہت کچھ ہے۔

(۹ : ۱۹—۲۲)

ایک صالح مومن کی تعریف اقبالؒ ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

مندرجہ بالا صفات کے لوگ صراطِ مستقیم پر رہنمائی کر سکتے ہیں، مگر ان کی پہچان میں احتیاط لازمی ہے، اور یہ قرآن و حدیث کی روشنی میں ہی کرنی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی پہچان کو مزید آسان کرنے کے لیے اس کی ضد اور مخالف راہ کو بھی واضح کر دیا تاکہ

صراطِ مستقیم کا مسافر ٹیڑھی راہوں سے بچتا رہے ۔ ارشاد ہوتا ہے کہ "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" یعنی صراطِ مستقیم کی مخالف راہ وہ ہے جس پر مغضوب اور الضالین چل رہے ہیں۔ انعام کی ضد غضب ہے ۔ فرماں بردار لوگ اگر انعام کے حقدار ہیں تو نافرمان غضب کے حقدار ہونے چاہئیں ۔ مغضوب وہ لوگ ہیں جنہوں نے راہِ حق پائی اور اُس کی نعمتیں بھی پالیں ، مگر پھر منحرف ہو گئے اور محرومی اور شقاوت کی راہ اختیار کرلی۔ دین کے احکامات کو جاننے اور پہچاننے کے باوجود شرارت یا نفسانی خواہشات کی وجہ سے خلاف ورزی کرتے رہے ۔ جیسے عام طور پر یہود کا حال تھا کہ دُنیا کے مفاد کی خاطر دین کو قربان کرتے اور انبیاء کی توہین کرتے ۔ "الضالین" وہ لوگ ہیں جو جہالت ، ناواقفیت یا تعصّب کی بنا پر راہِ حق پا ہی نہ سکے اور دین کے معاملے میں غلط راہ پر پڑ گئے ، یا مقررہ حدود سے نکل کر افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے ۔ مثلاً انبیاء کی تعظیم میں اتنے بڑھ گئے کہ اُن کو خدا بنا لیا ۔ ایک طرف تو اُن کی بات نہ ماننے اور دوسری طرف ان کی تعلیمات کے خلاف ان کو خدائی کا درجہ دیا ۔ چنانچہ صراطِ مستقیم کی سعادتوں سے محروم رہے ۔

(باقی)

التماس

ماہنامہ ترجمان القرآن کے کرم فرماؤں سے التماس ہے کہ وہ دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر اور پتہ خوشخط اور مفصل تحریر کیا کریں۔

(مینجر)

حالات و مقامات

بابری مسجد سے جموں کی مسجد تک

جناب عبد الہادی احمد صاحب

(۱)

گاندھی کے دیس بھارت میں سیکولرزم کی بنیادیں ہل رہی ہیں۔ بھارتی آئین کے چہرے سے ملمع اتر گیا ہے۔ نام نہاد مذہبی رواداری کی آڑ میں مسلمانوں کی جان و آبرو پر حملے کرنے والے اب ایسے دیدہ دلیر ہوگئے ہیں کہ علی الاعلان ان کے ایمان و اعتقاد کے خلاف صف آرا ہو رہے ہیں۔ گزشتہ ۳۹ برسوں میں اہنسا کے پجاریوں نے مسلمانانِ ہند کے لہو سے کتنی مرتبہ ہاتھ رنگے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق کل فرقہ وارانہ فسادات کی تعداد بیس ہزار سے متجاوز ہے۔ اس تعداد میں آتش زنی اور لوٹ مار کے چھوٹے موٹے واقعات شامل نہیں ہیں۔ ان فسادات میں لاکھوں مسلمان شہید ہوئے، لاکھوں بچے یتیم ہوئے اور اربوں ڈالر کی املاک لوٹ لی گئیں یا جلا دی گئیں۔

سیکولرزم کے علم برداروں نے اب مسلمانوں کے ایمان و عقیدے پر ہاتھ صاف کرنے کی سوچی ہے۔ گزشتہ برس کے دو واقعات نے نئی طرزِ فکر کی نشاندہی کر دی تھی۔ پہلے ہندوؤں کے ایک دریدہ دہن گروہ نے اعلیٰ عدالت سے مطالبہ کیا کہ قرآن پاک پر پابندی عائد کر دی جائے۔ کیونکہ یہ کتاب (نعوذ باللہ) تشدد کی تعلیم دیتی ہے۔ اس کے بعد اس ملک کی اعلیٰ ترین

"عدالت" نے شاہ بانو کیس میں اسلامی قانون کا مضحکہ اڑانے اور قرآنی احکام کی نفی کرنے کی کوشش کی۔ مسلمان عورت کے مقدمے کا خلافِ اسلام فیصلہ کرنے کا جواز یہ بتایا گیا کہ قرآن کی جو تعبیر مسلمان کرتے ہیں وہ درست نہیں لہٰذا انہیں (ہندو ججوں) حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بصیرت کے مطابق قرآن کی تشریح کریں۔

ان دو واقعات کے بعد سال نو کا آغاز ایک مسجد کو مندر بنانے کے عدالتی فیصلے سے ہوا ہے۔ بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی کے آبائی صوبے یوپی کے ضلع فیض آباد کے بڑے جج نے فیصلہ دیا کہ ۴۵۸ برس پرانی "بابری مسجد" رام جنم بھومی (رام بھگوان کی جائے پیدائش) ہے آئندہ یہاں خدائے واحد کے پرستاروں کو سجدہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی بلکہ ہزاروں مورتیوں اور پتھروں کو پوجنے والے ہی یہاں آسکیں گے۔ متعصب ہندو جج کا فیصلہ انصاف و قانون کے تمام اصولوں کے خلاف ہے۔ اس میں تاریخی شہادتوں کو جھٹلایا گیا۔ مسجد کے ٹرسٹیوں کے دلائل سننے سے انکار کرتے ہوئے ایک مکار ہندو وکیل رمیش پانڈے کے کذب و افترا کے پلندوں کو یکطرفہ طور پر سچ تسلیم کر لیا گیا۔ ہٹ دھرمی کی انتہا تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے ہائی کورٹ میں دائر کردہ چار رٹ درخواستوں کے فیصلے کا انتظار بھی نہ کیا گیا۔ پھر اسی پر اکتفا نہ کیا گیا، انتظامیہ نے ہندوؤں کو کھلی چھٹی دے دی کہ وہ مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لئے "جشنِ فتح" منائیں۔ چنانچہ ۵ فروری کو اکثریتی فرقے نے گھی کے چراغ جلائے، سنہرے پرچم لہرائے اور ان کے اجتماعات میں اسلام کے شعائر کا کھلا مذاق اڑایا گیا۔

بابری مسجد کو مندر قرار دینے کا فیصلہ ہی اتنا اشتعال انگیز تھا اس پر فتح کے جشن نے تو مسلمانوں کے دل چھید ڈالے اور وہ لہو کے آنسو روئے مگر سیکولر حکمرانوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ اس موقعے پر ریڈیو اور ٹیلیویژن نے تو تعصب اور جانبداری کی حد ہی کر دی۔ اُدھر ہندو تنظیموں نے اعلان کیا کہ ۵ فروری کو جشنِ مسرت و فتح منایا جائے اِدھر ریڈیو اور دُور درشن کے ہندی اور انگریزی خبرناموں میں یہ مژدۂ جاں فزا سنایا جانے لگا کہ "رام جنم بھومی" کے تالے کھلتے ہی رام کے بھگتوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی ہے۔ قرب و جوار کے علاقوں میں میلے کا سماں ہے اور وہ ۵ فروری کے جشن میں حصّہ لینے اجودھیا پہنچ رہے ہیں۔ ٹی وی کی سکرین

پر مسجد کے ایک حصے میں پوجا پاٹھ کرتے ہوئے نیم عریاں پجاری دکھائے گئے۔ کیمرے کو پجاریوں اور مورتیوں پر مرکوز رکھا گیا تاکہ لوگ مسجد کے محراب و منبر اور دوسرے نشانات نہ دیکھ سکیں۔ کیمرہ اگر ذرا بھی دائیں بائیں بھٹک جاتا تو ناظرین فارسی میں لکھی وہ عبارت ضرور پڑھ لیتے جو اس مسجد کی ناقابلِ تنسیخ تاریخ کی شہادت ہے۔ دیوار پر واضح طور پر کندہ ہے۔

"شہنشاہ بابر کے حکم سے کہ جس کا انصاف آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا ہے، یہ مسجد امیرِ خوش بخت، میر باقی نے سعید روحوں کے لیے تعمیر کی۔ خدا اس کار خیر کو ابدالآباد تک باقی اور قائم رکھے کہ یہی نیکی لازوال ہے۔" (ترجمہ)

بھارتی آئین کی دفعات ۱۴، ۱۵، اور ۱۶ میں صاف طور پر لکھا ہوا ہے کہ اس ملک کے باشندوں کے درمیان مذہب، نسل اور رنگ و لسان کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہ کیا جائے گا، مگر ۱۴ اور ۱۵ فروری کو بھارتی ریڈیو اور ٹیلیویژن نے آئین کے اس حصے کے پرخچے اڑا دیئے۔ بھارت کے مسلمانوں نے ۱۴ فروری کو پورے ملک میں یوم سیاہ اور یوم دعا منانے کا اعلان کیا تھا مگر ۵ فروری کے جشن فتح پر شادیانے بجانے والے ذرائع ابلاغ نے اس موقع پر دو لفظی اعلان تک کرنا مناسب نہ سمجھا۔ پورے ملک میں مسلمانوں نے دکانیں بند رکھیں گاڑیاں اور رکشے نہ چلائے۔ کروڑوں مسلمان مساجد میں اجتماعی طور پر دعاؤں میں شریک ہوئے، دہلی میں دو نوجوان ذاکر اور سبحان شہید ہوئے، سیہور میں آٹھ افراد کی جانیں گئیں، سری نگر میں ایک سو افراد شدید زخمی ہوئے، لکھنؤ، دہلی، میرٹھ، بدایوں اور بجنور میں احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ اتر پردیش کی اسمبلی میں مسلمان ممبروں نے اجلاس کا مکمل بائیکاٹ کیا[1] بارہ بنکی، کانپور، اناؤ، گونڈہ، ردولی، فریدپور، الہ آباد اور گورکھپور میں ہزاروں دکانیں بطور احتجاج بند رہیں، مگر بھارتی ریڈیو اور ٹیلیویژن کے نزدیک ان سب واقعات میں کوئی خبر نہ تھی۔ کوئی واقعہ، کوئی منظر، کوئی احتجاج اور کوئی جلسہ نہ ریڈیو پر جگہ پا سکا نہ ہی ٹیلیویژن سے دکھایا جا سکا۔

[1] صرف ایک رکن اسمبلی فضل الباری تحریک استحقاق پیش کرنے آئے سپیکر نے اجازت نہ دی تو وہ بھی واک آؤٹ کر گئے۔

پندرہ فروری کو سری نگر کے بازاروں میں پولیس نے خون کی ہولی کھیلی۔ "بابری مسجد" کے سانحے پر احتجاج کرنے والوں پر پولیس نے گولی چلائی اور محتاط اندازے کے مطابق ایک سو سے زائد افراد کو گولیوں سے زخم آئے۔ اس کے بعد سری نگر اور جموں میں کرفیو لگا اور اسی واقعے کو بہانہ بنا کر مرکز نے جی ایم شاہ کی کٹھ پتلی حکومت کو برطرف کر کے گورنر راج نافذ کیا۔

"بابری مسجد" جس کو مندر بنانے کے سانحے نے بھارت کے طول و عرض میں غم و غصے کی آگ لگا دی ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، بابر کے عہد میں صوبہ اودھ کے گورنر میر باقی بیگ نے تعمیر کرائی تھی۔ اجودھیا شہر میں ۹۳۵ ہجری (۱۵۲۸ عیسوی) میں تعمیر ہونے والی اس تاریخی مسجد کو چار سو برس تک کسی نے رام کی جنم بھومی نہیں کہا تھا۔ ہندوؤں کا دعویٰ تو نصف صدی پہلے کی بات ہے جب انگریزوں کے اشارے پر کچھ ہندو مہاشے مسجد پر حملہ آور ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں پہلی مرتبہ چند نیم پاگل پجاریوں نے اعلان کیا کہ بابر نے یہ مسجد مندر کو گرا کر تعمیر کرائی تھی ۔ پوچھا گیا کہ کب ؟ تو کہا گیا: "جب اس نے اجودھیا پر حملہ کیا تھا۔" جب تاریخی حقائق بتا کر ثابت کیا گیا کہ بابر نے تو کبھی اجودھیا پر حملہ نہیں کیا تو ہندو محققین بغلیں جھانکنے لگے۔ اس کے باوجود ان کا مطالبہ جاری رہا اور ایک مرتبہ کچھ بدبختوں نے مسجد پر حملہ کر کے اس کا مرکزی دروازہ اور گنبد مسمار کر دیا۔ مسلمانوں کے احتجاج پر صوبائی حکومت نے مسجد کی تعمیر و مرمت کرا دی اور اس کا انتظام سنی وقف بورڈ کے سپرد کر دیا۔ برصغیر کی آزادی کے بعد تو ہندو اور بھی دلیر ہو گئے۔ وہ مسلمانوں کو اپنا غلام سمجھ کر ہر اس چیز پر اپنا حق جتلانے لگے، جسے انگریزی دور میں ان سے چھیننے میں ناکام رہے تھے۔ چنانچہ ۲۲۔ اور ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب کو انھوں نے بابری مسجد پر شب خون مارا۔ ہندو پجاریوں کا گروہ رات کی تاریکی میں مسجد کے دروازے توڑ کر اندر گھس گیا۔ ان لوگوں نے رام اور سیتا کے بت مسجد میں سجا دیئے اور مسجد کو راتوں رات "مندر" بنا ڈالا۔ انتظامیہ ان کی پشت پر تھی۔ اگلی صبح مسلمانوں کو مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ مسلمان عدالت میں گئے، تو ہندو مجسٹریٹ نے کھلی کھلی دھاندلی کی۔ "فیصلہ" یہ کیا گیا کہ مسلمان مسجد میں داخل نہ ہوں بلکہ ان پر پابندی عائد کر دی گئی کہ وہ مسجد سے دو سو گز دور رہیں جبکہ ایک ہندو پجاری کو اجازت مل گئی کہ وہ رام اور سیتا

کی مورتیوں کی جھاڑ پونچھ، سیوا اور پوجا کے لئے وہاں آسکتا ہے۔ اس "بے مثال انصاف" کے بعد سے بابری مسجد پر قفل ڈال دیئے گئے۔ یہ فیصلہ کرنے والا جج کے کے نائر سے تھا جس نے بعد میں اپنی دھاندلی کو تسلیم کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا۔ ہندوؤں نے اس متعصب انسان کو قومی ہیرو قرار دیا اور بے ایمانی کے "انعام" کے طور پر اسے لوک سبھا کا ممبر بنا دیا۔

بابری مسجد کو رام کی جنم بھومی قرار دینے کا واقعہ دراصل ہندو قوم کی توسیع پسندانہ ذہنیت کا غماز ہے۔ اس ذہنیت کا سراغ بنگلور سے شائع ہونے والی ایک ہندو منجم کی ان پیشین گوئیوں سے ملتا ہے جن میں یہ فقرے بھی موجود ہیں:

"اگلی صدی میں تمام دنیا ہندو ہو گی، ہندو فوجیں یورپ پر فاتح کی حیثیت سے چڑھ دوڑیں گی۔ ایک سکھ جرنیل مشرق وسطی کو فتح کرے گا۔"

اس ذہنیت کا اظہار ہندو تنظیم آر ایس ایس کی شائع کردہ اس فہرست سے بھی ہوتا ہے جس کو ہٹ لسٹ کا نام دیا گیا ہے۔ اس ہٹ لسٹ میں ۲۳ مساجد کے نام دیئے گئے ہیں۔ یہ مساجد جو دہلی، متھرا، مراد آباد، جعفر آباد، للتی پور، جلور، بجنور اور بدایوں میں واقع ہیں، بابری مسجد کی طرح ہندو انہیں بھی مسمار کر کے وہاں مندر تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ مختلف مقامات پر مسلمانوں کو علی الاعلان دھمکیاں دی جاتی ہیں کہ اگر وہ اپنے بزرگوں کے گناہوں کی تلافی کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اور اگر انہوں نے اپنی مساجد خود ہندوؤں کے حوالے نہ کیں تو انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا۔ مختلف ہندو اخبارات اور جرائد میں ایسے مضامین اور ایسے مراسلات شائع ہو رہے ہیں جو دھمکیوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ گزشتہ ہفتے "ہندوستان ٹائمز" میں شائع ہونے والے ایک مقالے میں مسلمانوں کے آباؤ اجداد کی "حماقتوں" کی گوشمالی کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ اگر انہوں نے ہوش کے کان نہ لئے، تو تباہی ان کا مقدر ہو گی۔ مقالہ نگار مسلمانوں سے اور ان کے مستقبل سے بری طرح مایوس نظر آتا ہے اور اس کا ماتم یوں کرتا ہے:

"بدقسمتی سے مسلمانوں کا پاگل طبقہ اپنے آباؤ اجداد کی مذہبی حماقتوں کو بھلانے کے قابل نہیں ہوا۔"

ہندو ذہن کی عیاری اور توسیع پسندانہ عزائم کا اندازہ ایک ہندو پروفیسر امرناتھ کی

کتاب "تاریخِ عالم کے کچھ گمشدہ ابواب" (SOME MISSING CHAPTERS OF WORLD HISTORY) سے بھی ہوتا ہے۔ اس کتاب میں جو انکشافات کیے گئے ہیں ان کا علمی مقام تو اہلِ علم ہی متعین کریں گے لیکن ان کی تہہ میں تہذیبی برتری کا احساس اور ملک گیری کی ہوس صاف جھلکتی معلوم ہوتی ہے۔ پروفیسر امرناتھ "بھارت کی تاریخ کی تدوینِ نو" نامی ادارے کے ریسرچ فیلو ہیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس ادارے کے مقاصد میں ہندوستان کی تاریخ کی تنقیح و تطہیر کے علاوہ ہندو تہذیب کو دنیا کی قدیم ترین تہذیب اور ہندو تمدن کو دنیا کا برتر تمدن ثابت کرنا شامل ہے۔ یہ ادارہ بھارتی تاریخ کو اسلامی دور کی تہذیبی اور لسانی اثرات سے بھی "پاک" کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے پروفیسر امرناتھ نے جن "حقائق" کا سراغ لگایا ہے، ذرا ان کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:۔

کتاب میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ آگرے کا تاج محل ایک قدیم ہندو مندر کا کمپلکس تھا جسے شاہجہان نے غاصبانہ طور پر قبضے میں لے کر اسے اپنی ملکہ ممتاز محل کے مزار میں بدل ڈالا۔ دہلی کے لال قلعے کے بارے میں انکشاف کیا گیا ہے کہ یہ قدیم ہندو قلعہ "لال کوٹ" ہے جسے ایک ہندو راجے نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے گیارہ سو برس پہلے تعمیر کرایا تھا۔ مختلف مسلمان سلاطین کے بسائے ہوئے شہروں احمد آباد، فتح پور سیکری، تغلق آباد، فیروز پور اور حیدر آباد وغیرہ کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ شہر ہندو راجوں نے تعمیر کیے تھے، بعد غاصب مسلمان بادشاہوں نے ان کے نام بدل کر ان پر غاصبانہ قبضہ کر لیا اور قدیم ہندو آثار کو مٹا ڈالا۔ پروفیسر صاحب نے ہندو تہذیب کو عالمگیر تہذیب قرار دیتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ اٹلی قدیم دور میں ایک ہندو ملک تھا اور اس دور کا پوپ ہندو پجاری تھا۔ انگلش کو سنسکرت کی ایک شاخ قرار دیا گیا ہے اور ویسٹ منسٹر ایبے (لندن کے مشہور چرچ) کو شیواجی کا قدیم مندر ٹھہرایا گیا ہے۔

پروفیسر امرناتھ کے "انکشافات" کی روشنی میں بابری مسجد کو رام جنم بھومی بنانے کا واقعہ اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ دوسری معروف مساجد کی ہٹ لسٹ تیار کرنے کا پروگرام بھی اس تناظر میں بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ جب عزائم ایسے ہوں، تو کیا بعید کل کلاں کوئی ہندو محقق

شاہی مسجد لاہور کی تعمیر کا سہرا چندر گپت موریہ کے سر باندھے۔ اب تو یہ خطرہ ہے کہ (خاکم بدہن) وہ کعبۃ اللہ اور مسجد نبویؐ پر دعویٰ نہ کر بیٹھیں۔

ہر قوم کو اپنی تہذیب کی ترقی اور تمدن کے عروج کے لئے جدوجہد کا حق حاصل ہے۔ ہم ہندو قوم کا بھی یہ حق مانتے ہیں۔ مسلمانوں نے کبھی ان سے مندروں کو مسمار کر کے مسجدیں تعمیر کرنے کا مطالبہ نہیں کیا۔ لیکن وہ مذہبی جنون میں مسلمانوں کے ملّی آثار کو مٹانے اور اسلامی شعائر کو بگاڑنے پر تلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بھارت کا مسلمان آج اس خوف میں مبتلا نظر آتا ہے کہ اگر مساجد کو مندروں میں بدلنے کا یہ سلسلہ شروع ہو گیا تو کہیں نہ رک سکے گا۔ پندرہ کروڑ مسلمان اپنے ملّی تشخص اور دینی وجود کی حفاظت کے لئے ستر کروڑ ہندوؤں میں گھر گئے ہیں یہ دنیا بھر کے مسلمانوں کا ملّی فریضہ ہے کہ وہ بھارتی مسلمانوں کی مدد کریں۔

---

(۲)

مقبوضہ کشمیر میں حالیہ فسادات کی آگ اس وقت بھڑکی جب جی ایم شاہ حکومت نے جموں کے سول سیکرٹریٹ میں واقع ایک مسجد کو مندر میں بدلنے کی منظوری دے دی۔ اس پر بابری مسجد کے سانحے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ واقعات کے مطابق جموں شہر جو ریاست کا سرمائی صدر مقام ہے۔ سردیوں کے ایام میں سری نگر سے سرکاری دفاتر اور ملازمین یہاں منتقل ہو جاتے ہیں۔ حکومت نے مسلمان ملازمین کے اس مطالبے پر کہ نماز باجماعت کے لئے مسجد تعمیر کی جائے عمارت کا ایک حصہ نماز کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ اس پر ہندوؤں نے شور مچایا کہ مسجد کی جگہ ایک مندر کا حصّہ ہے جو اس سے پہلے یہاں موجود تھا لہٰذا مسجد ہٹائی جائے۔ شاہ حکومت نے فساد کے ڈر سے ہندوؤں کا یہ ناجائز مطالبہ فوری طور پر مان لیا۔ مسجد میں نمازیوں کو جانے سے روک کر وہ مقام ہندو انتہا پسندوں کے حوالے کر دیا۔ جموں اور کشمیر کے طول وعرض میں غم و غصّے کی لہر دوڑ گئی۔ ادھر اجودھیا میں بابری مسجد کا سانحہ پیش آ گیا۔ وادئ کشمیر کے

مسلمانوں نے قدرتی طور پر اس پر بھی اپنے ردِّ عمل کا اظہار کیا۔ آغاز احتجاجی مظاہروں سے ہوا پھر ہندو انتہا پسند تنظیم شیوسینا بھی میدان میں اتر آئی۔ مسلمانوں کے جلوسوں میں چھرے گھونپنے کے واقعات پیش آئے۔ ہندو انتہا پسندوں کی جارحیت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے جلوسوں میں یہ نعرہ لگاتے پھرے:

"ہند میں رہنا ہے تو بندے ماترم کہنا ہوگا"

مسجدوں کو مندر بنانے کے سانحوں کے خلاف اور ہندوؤں کی اشتعال انگیزیوں کے خلاف مسلمانوں کے جذبے بھی بے لگام ہوکر رہے۔ سری نگر، جموں، بارہ مولا، اسلام آباد سوپور اور بیسیوں دوسرے شہروں اور قصبوں میں لاکھوں فرزندانِ توحید نے "اللہ اکبر" کے پرچموں اور نعروں کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ پولیس کی وحشیانہ فائرنگ، پکڑ دھکڑ اور مار دھاڑ سے پوری وادی لرزنے لگی۔ جموں میں پچاس سے زیادہ مسلمان پولیس کی لاٹھیوں اور گولیوں سے زخمی ہوئے۔ سری نگر میں ایک سو سے زیادہ افراد زخمی ہوئے۔ اکثریت کو گولیوں کے زخم آئے۔ مسلمانوں کی املاک جلائی گئیں۔ ترہگام میں سٹڈی سرکل کے ایک دفتر میں چھ ہزار سے زیادہ کتابیں جلائی گئیں۔ پولیس نے راہ چلتے پرامن لوگوں پر لاٹھیاں برسائیں۔ مکانوں کے اندر گھس کر چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو مارا پیٹا گیا اور خواتین کی بے حرمتی کی گئی۔ کرفیو لگ گیا، گولیاں چلیں، مگر عوام کا احتجاج نہ تھما۔

ان ہنگاموں کی پوری ذمے داری متعصب ہندو تنظیموں پر عائد ہوتی تھی، مگر حکومت نے حسبِ سابق جماعت اسلامی کو نشانۂ ستم بنایا۔ چند روز کے اندر اندر جماعت اسلامی کے ڈیڑھ سو سے زیادہ کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ جیلوں میں جماعت کے کارکنوں سے انتہائی شرمناک سلوک روا رکھا گیا۔ پہلے دس گھنٹے تک کھانا پینا تو کیا نماز ادا کرنے کی اجازت دی گئی، نہ وضو کے لئے پانی فراہم کیا گیا۔ جماعت کے ان نو گرفتاروں کے علاوہ پچاس کے قریب کارکن اور قائدین پہلے ہی کشمیر کی مختلف جیلوں میں موجود تھے۔ ان حضرات کے ساتھ "نوازش" کا معاملہ اس طرح ہے کہ جونہی پہلی نظر بندی کی معیاد ختم ہوتی ہے جیل کے حکام انہیں رہائی کے پروانے دے کر جیل کے دروازوں تک لاتے ہیں اور پھر نظر بندی کے نئے احکام پر دستخط لے کر واپس اندر

سیلوں میں پہنچا دیتے ہیں ان میں وہ بھی ہیں جو شدید بیمار ہیں اور جیل میں انہیں علاج کی سہولتیں تک فراہم نہیں کی جاتیں۔

جماعت اسلامی پر اس عتاب کے باوجود کشمیر کے ہندو گورنر جگ موہن کو اطمینان نہ تھا چنانچہ انہوں نے مرکزی حکومت کو حال ہی میں جو خط لکھا ہے اس میں جی ایم شاہ حکومت پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ وہ جماعت اسلامی اور دوسرے پاکستان دوست عناصر کو نواز رہی ہے جگ موہن نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا کہ جماعت مقبوضہ کشمیر میں "نیا اسلام" پیش کر رہی ہے۔ وہ عرسوں، پیروں، فقیروں اور درویشوں کی مخالف ہے لہٰذا اس پر پابندی عائد کرنا ضروری ہے۔ ہندو گورنر نے "اسلام دوستی" کا ثبوت دیتے ہوئے نہ صرف جماعت اسلامی پر پابندی لگانے کی سفارش کی، بلکہ جی ایم شاہ کو "جماعت نوازی" کے الزام میں برخاست بھی کر دیا۔ یونائیٹڈ پریس آف انڈیا کے مطابق کشمیر کے گورنر نے جی ایم شاہ وزارت توڑنے سے پہلے وادی میں امن و امان کی صورت حال پر بے حد تشویش کا اظہار کرتے ہوئے مرکز کو لکھا کہ پاکستان دوست عناصر پولیس اور گورنمنٹ سروسز میں داخل ہو گئے ہیں۔

توقع کے عین مطابق ۷ مارچ کو گورنر کشمیر نے جی ایم شاہ کی حکومت توڑنے اور اسمبلی کو معطل کرنے کا اعلان کیا۔ اس سے پہلے ڈاکٹر فاروق اپنے بہنوئی (جی ایم شاہ) کی شکایت لے کر دہلی جا چکے تھے۔ راجیو گاندھی سے ملاقات کے بعد ان کا یہ اعلان کہ مقبوضہ کشمیر میں امن و قانون کی مشینری ناکام ہو گئی ہے معنی خیز تھا۔ شائد شاہ صاحب بھی حالات کی رفتار کو پڑھ رہے تھے کہ ادھر ان کی حکومت کی تحلیل کا اعلان ہوا ادھر انہوں نے اپنی پارٹی سمیت ڈاکٹر فاروق کی نیشنل کانفرنس میں ضم ہونے کا اعلان کر دیا۔ جی ایم شاہ اور ڈاکٹر فاروق میں سیاسی اختلافات کے باوجود ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں اقتدار کے بھوکے ہیں۔ جی ایم شاہ ہر قیمت پر اقتدار کی دیوی کے چرنوں میں رہنا چاہتے ہیں، مگر فاروق عبداللہ نے انہیں شریک اقتدار کرنے کی ہر امید منقطع کرتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ بھگوڑوں کے لئے ان کی پارٹی میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

مقبوضہ وادئ کشمیر کی تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ ہزاروں فرزندانِ توحید جیلوں میں ہیں اور

..شیخ عبداللہ کے ہونہار سپوت" ایک بار پھر کٹھ پتلی حکومت کے سربراہ بن کر کشمیر کے منظر پر ابھرنے والے ہیں۔ مرکز سے ان کے حالیہ رابطے اسمبلی میں ان کی پارٹی پوزیشن اور نئے انتخابات کی صورت میں کامیابی کے قوی امکانات اس کا صاف پتہ دیتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر فاروق کے برسر اقتدار آنے سے بھی کشمیر کی قسمت نہیں سنورے گی۔ بھارتی حکومت اٹھا کر گرانے اور گرا کر اٹھانے کی پالیسی کے ذریعے مطلوبہ اور من پسند نتائج حاصل کرنے میں پوری طرح کامیاب ہو رہی ہے۔ ایک وفاشعار خادم کو دھتکارنے اور دوسرے کو چمکارنے سے غرض یہ ہے کہ نیا آنے والا کشمیری مسلمانوں پر زیادہ جوش و خروش سے تشدد کرے اسلام پر نئی پابندیاں عائد کرے اور جماعت اسلامی، سٹڈی سرکل، پیپلز لیگ اور دوسری اسلام دوست تنظیموں پر مزید عرصۂ حیات تنگ کرے۔ ڈاکٹر فاروق کے ماضی کے کارناموں کو نگاہ میں رکھیں، تو ان سے بھی یہی امید کی جا سکتی ہے۔

ترکی میں نئے قانون کا نفاذ

ترکی کی سرکاری پارٹی "مدر لینڈ" نے پارلیمان میں خدا اور رسول کی توہین پر پابندی عاید کرنے کا بل پیش کر کے منظور کرا لیا۔ آئندہ ترکیہ میں کسی شخص کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے خلاف توہین آمیز الفاظ کہہ سکے۔ ایسی جرأت کرنے والوں کو ایک سال تک قید کی سزا دی جا سکے گی۔ اگر اسلامی تحریک کی طرف سے اس قانون کے اجرا پر کسی گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا گیا، تو اس وجہ سے کہ وہ زیادہ سخت سزاؤں کا مطالبہ کرتے ہیں اور لادین عدالتوں کی موجودگی میں اس قانون کے نفاذ کے بارے میں کچھ امید نہیں، لیکن دہریت زدہ ماحول میں اس قانون کے نفاذ کو تازہ ہوا کا جھونکا ضرور کہا جا رہا ہے۔

رسائل و مسائل

"لہوالحدیث" کی تشریح اور افسانہ و ناول

نعیم صدیقی

سوال: تفہیم القرآن پڑھتے ہوئے یہ مقام سامنے آیا کہ:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ

"اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلامِ دلفریب خرید کر لاتا ہے۔"

مولانا نے افسانے اور ناول لَهْوَ الْحَدِيْث کے زمرے میں رکھے ہیں، مگر اگر ناول نسیم حجازی کے لیے جائیں یا اسلم راہی کے اسلامی تاریخی ناول، تو سوچ اور ہوجاتی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، اسلم راہی کا ایک بھی نہیں اور نسیم حجازی کے دو ناول پڑھے ہیں۔ میری زندگی پر ان دو ناولوں نے کچھ انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ نہ صرف ہیرو بلکہ تمام مسلمانوں کا کردار اور کچھ مسلمانوں کی غداریاں واضح ہوتی ہیں۔ مختلف زاویوں سے زندگی کے مختلف پہلوؤں کی اصلاح نظر کے سامنے آتی ہے۔ پھر ہیرو کا وقار، اس کا کردار، اس کی شخصیت بالکل مردِ مجاہد، مردِ قلندر، مردِ درویش کی طرح ہوتی ہے۔ اگر انہیں اپنا آئیڈیل بنائیں تو زندگی دوسرے لوگوں سے مختلف ہوجاتی ہے۔ میں نے ایک "قافلۂ حجاز" اور ایک "شاہین" ناول پڑھا ہے۔ مجھ پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ پھر یہ ہیرو بالکل اقبالؒ کے اشعار جو مسلم نوجوان کے لیے کہے گئے ہیں، کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تحریک اسلامی کے اپنے لٹریچر میں ناول بھی براجمان ہے اور افسانے بھی دھرنا مار کر بیٹھے ہوئے ہیں تو پھر تفہیم القرآن جلد چہارم سورۂ لقمٰن صفحہ ۸ پر جب کلام دلفریب کی شرح یا تفسیر پڑھی جاتی ہے اور وہ یہ کہتی ہے کہ اور بھی بہت کچھ ہے، مگر ناول اور افسانہ بھی لہوالحدیث کے زمرے میں آتے تو قرآن کا شیدائی، قاری یہ پڑھتا ہے تو اس کا ذہن آپ کے اس جواز پر نہیں جاتا کہ اگر ناول اچھے لکھے ہوئے ہوں یا افسانے اصلاحی ہوں تو کچھ حرج نہیں پڑتا۔ وہ تو سیدھا سادا سا اعتراض جڑ دے گا کہ دیکھیے اس جماعت کے امیر نے تفہیم القرآن میں جو کچھ لکھا اس کے پیروکار اس کے خلاف اپنی تحریروں میں ناول اور افسانے پڑھتے بھی ہیں اور لکھتے بھی ہیں۔

اس کی وضاحت کریں۔

جواب:۔ خدا ملا۔ آپ کے اندر دین سے جو لگاؤ ہے اور جس طرح کا جذبۂ تلاشِ حق ہے، خدا اس میں برکت دے اور آپ کو صدق و صواب کے راستے پر چلنے کی توفیق دے۔

آپ نے تفہیم القرآن میں سورہ لقمٰن کی آیت ۶ کے ترجمے کا حوالہ دے کر اپنا اشکال پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلا ضروری امر یہ تھا کہ آپ آیت کے اصل مدعا کو سمجھنے کے لیے اس کے اہم اجزا پر غور کرتے۔ مثلاً "لھوالحدیث" خرید کر لانے کا مقصد یہ بتایا کہ "لیضل عن سبیل اللہ"۔ یعنی مطلوب اللہ کی راہ سے بھٹکانا ہو، کتاب حکیم کی طرف سے توجہ ہٹانا ہو۔ پھر الفاظ ہیں "بغیر علم" کے۔ وہ دین یا اللہ کی راہ یا کتاب حکیم کا علم بھی نہ رکھتا ہو کہ سوچ سمجھ کر اس نے فیصلہ کیا ہو کہ "کتاب حکیم" سے اس کا اہم کردہ "لھوالحدیث" زیادہ گراں قدر ہے۔ پھر الفاظ ہیں "ویتخذھا ھزوا"۔ مراد یہ کہ وہ "سبیل اللہ" کا مذاق اڑاتا ہے۔ آخرِ کلام یہ کہ ایسے لوگوں کے لیے عذاب مھین ہے۔

پھر صاحب تفہیم القرآن کے حواشی سے اگر استفادہ کیا جائے تو چند اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔
ا۔ لھوالحدیث خریدنے کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ وہ شخص حدیثِ حق کو چھوڑ کر حدیثِ باطلہ کو اختیار کرتا ہے۔

۲— اُن باتوں کی طرف راغب ہوتا ہے جن میں اس کے لیے نہ دُنیا میں کوئی بھلائی ہے نہ آخرت میں۔

۳— نضر بن حارث نے قریش کے لوگوں سے کہا کہ جس طرح تم اس شخص (نبی اکرمؐ) کا مقابلہ کر رہے ہو۔ اس سے کام نہ چلے گا...... ٹھہرو! اس کا علاج میں کرتا ہوں...... اُس نے قصہ گوئی کی مجلسیں برپا کرنا شروع کیں...... اس مقصد کے لیے گانے والی لونڈیاں بھی خریدی تھیں۔

متذکرہ ساری باتوں کو سامنے رکھیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ قصے کہانیاں اور لہو و لعب کی باتیں مراد ہیں جو دعوت الی اللہ اور تعلیم قرآن کے فروغ میں خلل ڈالیں اور انسان کو خواہشات و لذات کی دُنیا میں گم کر دیں۔ یہاں حملہ ان کے خلاف ہے۔ ورنہ فی نفسہٖ اگر شاعری یا قصہ کہانی کا سلسلہ یکسر ممنوع ہوتا تو نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حسان بن ثابت کو منبر پر بٹھا کر ان سے شعر پڑھواتے اور نہ ازواجِ مطہرات کو حدیث خرافہ جیسے قصے سُناتے۔

خود مولانا مودودیؒ نے ادب کے متعلق جو انٹرویو دیئے اور جو تقریریں کیں وہ اگر آپ کے سامنے ہوں تو آپ کو معلوم ہو کہ وہ ادبیات کو تین حصوں میں تقسیم کرتے تھے۔ ایک کافرانہ ادب، دوسرا جائز ادب، تیسرا اسلامی ادب۔ مشرقی پاکستان کے بیت المکرم میں ایک لمحہ آزمائش میں انہوں نے فرمایا تھا کہ کاش کہ یہاں کے لوگوں کے لیے اقبال کی شاعری اور نسیم حجازی کے ناولوں کے ترجمے کیے گئے ہوتے۔

ادب ایک عظیم قوت ہے جسے دُنیا کی مختلف قوموں نے استعمال کیا ہے اور خاص طور پر آج کے زمانے میں جتنے بڑے اور منظم پیمانے پر کمیونسٹوں نے اپنے نظریات اور اپنی تحریک کا راستہ بنانے کے لیے شعر و افسانہ سے کام لیا ہے، اس کو دیکھنے کے بعد مسلمان قوتوں کا ادب کی طاقت سے غافل ہو کر بیٹھ رہنا اپنے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے مترادف ہے۔

ادب کی بحثیں آج کہاں سے کہاں پہنچ گئیں۔ لیکن آپ اور دوسرے بے شمار بھائی ابھی تک ان سوالات میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ کہانیاں جائز ہیں یا ناجائز؟ اور کیا کوئی مسلمان افسانہ یا ناول لکھ سکتا ہے؟

افسانہ و ناول پر ادب ناشناس حضرات فقیہانہ ذہن سے کبھی کبھی یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ وہ جھوٹ پر مبنی ہوتے ہیں۔ گلستانِ سعدی آپ نے پڑھی ہے؟ حکایاتِ مولانا روم پڑھی ہیں؟ کلیلہ دِمنہ پڑھی ہے؟ اردو میں شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار پڑھا ہے؟ اس طرح کی چیزوں سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ کہانیاں صورتِ مفروضہ پیش کرتی ہیں کہ اگر یوں ہو تو کیا ہوتا ہے۔

کہانیاں ایسے واقعات کو لاتی ہیں جو یا تو انسان کے ذہن میں بہ شکلِ تصور پائے جاتے ہیں، یا معاشرہ میں حقیقی طور پر وہ ایسے کرداروں کو دکھاتی ہیں جن کے نمونے ہمارے سامنے موجود ہوتے ہیں۔ یا جن کا ہونا ہم بآسانی تصور میں لا سکتے ہیں۔ فرق یوں پیدا ہوتا ہے کہ بعض لوگ کہانیاں محض تفریحاً لکھتے ہیں اور ان کے ساتھ کوئی مفید اُصول و مقصد نہیں ہوتا۔ دوسری طرف کچھ لوگ اس احساس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ پڑھنے والا اچھے افکار، اچھے اُصولوں، اچھے کرداروں، اچھی قدروں اور اچھے فیصلوں کی طرف مائل ہو۔ یا فرق یہ ہوتا ہے کہ بعض لوگ اسفل جذبات اور فحش اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں اور بعض پاکیزگیٔ جذبات اور حسنِ گفتار کا خیال رکھتے ہیں۔

ادب کسی بھی دَور میں انسانی جذبات و احساسات کی زبان ہوتا ہے۔ آپ اپنی حد تک یہ زبان بند رکھتے ہیں، مگر یہاں دوسری قوتیں آپ کے خلاف جذبات و احساسات کی زبان کا استعمال کرتی ہیں۔ حد یہ کہ دیندار مسلمانوں کی اکثریت وقت کے ادب کو جانتی ہی نہیں۔ سَو میں سے دو آدمی ادبیات کا مطالعہ کرنے والے مل جائیں تو بڑی بات ہوگی۔ خادمانِ اسلام میں سے بہت کم کو یہ علم ہے کہ مخالف محاذ سے کس زور کا سیلاب اُمڈا چلا آرہا ہے۔ ادب کے نظریات کیا کیا رائج ہیں۔ بحثیں کیا کیا چل رہی ہیں۔ اسلام کی علمبردار قوتوں کو ادبی لحاظ سے کتنا کام کس رفتار سے کرنا چاہیے۔

میں نے ایک لمبا دَور دعوتِ اسلامی اور تحریکِ اسلامی کے ساتھ گزار کر یہی اندازہ کیا ہے کہ ادب کو ہمارے حلقوں میں کوئی وقعت حاصل نہیں۔ ادبی کام کرنے والوں کا کوئی مقام نہیں۔ اگر کچھ دوست ادب سے دلچسپی دکھاتے ہیں تو زیادہ تر مروّتاً اور وہ بھی سرسری یا باتی

دی ہے۔ اس سلسلے میں جو نسکا نے کی کوششیں کی گئیں، مگر "دریا کو اپنی موج و طغیانیوں سے کام"۔ اب مجھے یہی تشویش ہے کہ کچھ عرصہ بعد اس پسپائی کا احساس ہوگا جو ادبی کام کی کوتاہی کی وجہ سے غیر محسوس طور پر واقع ہو رہی ہے۔ آخر ایک نہ ایک دن اس کمی کی تلافی کا جذبہ بیدار ہوگا۔

تو میری گذارشات کا مطلب یہ ہے کہ دعوتِ دین کے تقاضوں کو بس اسی حد تک محدود نہ سمجھیے کہ درسِ قرآن ہو گیا یا نوافل پڑھے گئے، بلکہ ایک ضرورت یہ ہے کہ علمی سطح پر اسلام کا مضبوط لٹریچر موجود ہو، تعلیمی سطح پر اس کو وزن حاصل ہو۔ صحافت اور ذرائع ابلاغ کی سطح پر اس کی نیر نگیاں جگمگائیں اور شعر و ادب کی سطح پر اسلامی جذبات و رجحانات کے پھول کھلیں اور مہک پھیلائیں۔

ہر وہ کہانی باعثِ ثواب ہے جو خدا پرستانہ جذبات اور اخلاق و اقدار کی آبیاری کرتی ہے۔ ہر وہ کہانی جائز حدود میں ہے جو اسلام کے کسی اصول و قدر سے ٹکراتی نہیں اور ہدایت کی راہیں روکتی نہیں۔ اس کے بعد ہر وہ کہانی قابلِ استرداد ہے جو مخالفِ اسلام نظریات اور اقدار و اطوار کا اثبات کرتی ہو اور اسفل کرداروں کو پسندیدہ بنا کر دکھائے۔ یہی تعریف شعر اور مجموعی طور سے ادب پر بھی درست آئے گی۔

بس اتنی بات پلے باندھ لیجیے اور پھر اطمینان سے اپنے کام میں لگ جائیے۔

مطبوعات

جامعہ عثمانیہ مؤلفہ جناب ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی سابق وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ و محمود ابراہیم سابق ناظم تعمیرات مملکتِ آصفیہ (حیدر آباد دکن)۔ ناشر: بہادر یار جنگ اکادمی سراج الدولہ روڈ۔ بہادر آباد، کراچی۔ ص ۱۳۵۔ قیمت -/۳۰ روپے

جامعہ عثمانیہ محض ایک یونیورسٹی کا نام نہیں، بلکہ ایک عظیم الشان تعلیمی تجربے کا نام ہے۔ سید جمال الدین افغانی نے برصغیر میں یہ آواز اُٹھا کر ایک تحریک پیدا کی کہ یہاں تمام علوم کے لیے ذریعہ تعلیم اردو کو بنایا جائے، پھر اس کے مطابق اوّلین تجربہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے کر دکھایا۔ علوم، فنون، سائنس اور تیکنیکیات کی تعلیم پوسٹ گریجویٹ سطح تک اردو زبان میں دی گئی۔ کئی نصابی کتب تیار کی گئیں۔ اصطلاحات کے تیزی سے ترجمے کر لیے گئے اور پھر اہل علم کی جو صف اس یونیورسٹی سے تعلیم پاکر نکلی وہ قابلیت اور تخلیقی صلاحیت کے لحاظ سے اوروں سے برتر ہی تھی۔ آج وہاں کے فارغ التحصیل حضرات پاک و ہند ہی میں نہیں امریکہ اور یورپ میں اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اس مختصر کتاب میں اس تجربے کی پوری تاریخ بیان کر دی گئی ہے اور ان تمام اداروں اور افراد کا ذکر ہے جنہوں نے اس خدمت کی انجام دہی میں حصہ لیا۔ پورے انتظامات کے نشوونما و ارتقاء کی داستان کہی گئی ہے۔ تنخواہوں اور دیگر مصارف کا ذکر ہے، امتحانات اور رہائشی انتظامات کا بیان ہے۔ افراد اور انتظامات کے ادل بدل اور تغیرات کا اندراج ہے۔ قاضی محمد حسین پرو وائس چانسلر (زمانہ تقرر ۳۸ - ۱۹۳۷) کا یہ معروف عام جملہ کہ "علم نامانوس زبانوں میں مقید تھا، اس جامعہ میں اپنی زبان میں آکر آزاد ہو گیا۔" کیا پاکستان کے لیے اس میں کوئی سبق نہیں!

"بتول" سالنامہ ۱۹۸۶ء | بہ ادارت: نسیم آراء وسلمیٰ یاسمین نجمی۔
ادارتی امور کے لیے پتہ: پوسٹ بکس ۴۵۲، راولپنڈی صدر۔
ترسیل زر وغیرہ کے لیے پتہ: ۸۔ سلطان احمد روڈ، اچھرہ، لاہور۔
قیمت سالنامہ فی شمارہ ۱۰/- روپے۔ سالانہ چندہ ۳۲/- روپے۔ سرورق رنگین وخوشنما۔

ماہنامہ بتول کا یہ سالنامہ سوا دو سو صفحوں کے دامن میں بہت سا سرمایۂ دین وادب سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ بڑی مسرت انگیز حقیقت ہے کہ خواتین کی ادارت میں اور زیادہ تر خواتین ہی کی قلمی معاونت سے چلنے والا یہ رسالہ ایک طرف تو اپنی پاکیزہ تدرج کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے، دوسری طرف یہ بات بھی حوصلہ افزا ہے کہ یہ رسالہ بڑے عزم واستقلال سے اپنا راستہ بناتا ہوا اب اپنی تیسویں جلد کا آغاز کرچکا ہے اور تیسرا خوش آئند پہلو یہ ہے کہ بتول کا معیار روز بروز بہتر ہوتا جا رہا ہے، خصوصاً خواتین کی تحریروں اور ان میں سے بھی امتیازی طور پر افسانوی مواد کو مقام وقوت حاصل ہے۔

اداریے کے بعد حمد ونعت کے صفحات ہیں، پھر دانش وحکمت کا عنوان آتا ہے، بعد ازاں ۱۵ افسانے، ایک ناول، ایک طویل ناول کی قسط، دو مقالات، ایک خاکہ اور ایک انشائیہ ۴ غزلیں اور ۸ نظمیں سالنامے کے گلدستہ میں حسن وخوبی سے مرتب کرکے ادارہ بتول اپنے پڑھنے والوں اور پڑھنے والیوں سے اپنی صلاحیتوں کے لیے یقیناً خراجِ اعتراف حاصل کرے گا۔

لکھنے والوں اور لکھنے والیوں میں سے چند نمایاں نام یہ ہیں: پروفیسر اسرار احمد سہاروی، سفسروی، بنت الاسلام، حفیظ الرحمٰن احسن، لالہ صحرائی، قانتہ رابعہ، سمیعہ سالم، صالحہ صبوحی، غافل کرنالی، طاہر قریشی، الطاف شاہد۔ بنتِ مجتبیٰ مینا، ام زبیر، نیر بانو، پروفیسر فروغ احمد، شفیق ہاشمی، فرزانہ رباب اور تمنا علیگ۔ سارے لکھنے والے قابلِ قدر ہیں مگر اختصار واجب ہے۔

افسوس کہ اتنی جگہ نہیں کہ مختلف تحریروں پر الگ الگ گفتگو کی جاسکے۔

پاکستان اسٹیٹ آئیل ریویو (خصوصی سیرت نمبر)

مولف: شاہ مصباح الدین شکیل - ناشر، جناب عبدالجلیل، شعبۂ امور عامہ، پاکستان اسٹیٹ آئیل کمپنی لمیٹڈ - پوسٹ بکس نمبر ۳۹۸۳ - کراچی -

پُرانی ضرب المثل تھی: "پڑھیں فارسی، بیچیں تیل" - اب نئی شکل یہ ہو گئی کہ "بیچیں تیل، چھاپیں سیرتِ پاک" - سبحان اللہ - ہم بہت بڑے سائز کے ۸۴ صفحات پر آرٹ پیپر کے رنگین ٹائیٹل اور آفسٹ کی نفیس چھپائی کے ساتھ سیرت پاک کے چند ابواب کو دیکھ کر باغ باغ ہوئے ـــ باتیں مکمل، لفظ کم، عبارت سلیس، تصاویر اور نقشوں سے مزین، قرآن و صحاح ستہ کے علاوہ ۴۶ کتبِ حوالہ کی فہرست ہے - پہلے ایک حصہ سیرت احمد مجتبیٰ ـــ "ولادت سے غارِ حرا تک" پی - ایس - او کی طرف سے ۱۹۸۴ء میں شائع ہو چکا ہے - اب ۱۹۸۵ء میں غارِ حرا سے ہجرتِ حبشہ تک" آیا ہے - اب " ہجرتِ حبشہ سے مسجد نبوی تک" کا حصہ آئے گا - اور پھر "مسجد نبوی سے سفر آخرت تک"۔

ہم اس پیش کش پر جناب مؤلف اور پی - ایس - او (P.S.O) کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں -

---

(بقیہ معاشی ترقی کے لیے اسلامی تدابیر)

اسلام کا معاشی نظام انصاف و توازن، معاشرتی مساوات اور غریب کی دستگیری کے لیے منفرد معاشی نظام ہے - دُکھ درد کی ماری ہوئی انسانیت کی فلاح ہر دور میں اسلام کے معاشی نظام میں ہی مضمر رہی ہے - حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نوعیت کا معاشی نظام اسلامی معاشرے میں رائج کیا تھا اس میں ہر شخص کی ضروریات کی کفالت کا اہتمام تھا - آج بھی انسان کو ایسے ہی معاش کے نظام کی ضرورت ہے جس کا نمونہ آپ نے اپنی سوسائٹی میں پیش کر کے دکھایا تھا -

---

سید ابو الاعلیٰ مودودی

کی

اوّلین تصنیف

الجہاد فی الاسلام

— جو کہ ۲۳ سال کی عمر میں تحریر کی گئی۔

— جس کی علامہ اقبال نے بھی تعریف و تحسین فرمائی۔

— جسے تحریکِ قیامِ پاکستان کے دوران میں مسلمانوں میں جذبہ جہاد پیدا کرنے کے لیے کثیر تعداد میں پھیلایا گیا۔

— اسلام کے نظریہ جہاد اور قانونِ صلح و جنگ کی بہترین اور مکمل تصویر۔

— دیگر مذاہب و اقوامِ عالم کے جنگی مقاصد و نظریات۔

اور

— بین الاقوامی قانونِ قتال کا تقابلی مطالعہ۔

— اسلامی قوانین جہاد کی برتری کے تفصیلی دلائل۔

— جہاد کے مخالفین و معترضین کا مسکت جواب۔

— درجنوں کتب و دستاویزات کے مطالعہ کا نچوڑ۔

۶۰۰ صفحات — قیمت: ۳۸/- روپے مجلد ۴۵/- روپے

اِدارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ۔ رحمٰن مارکیٹ۔ غزنی سٹریٹ

اردو بازار، لاہور۔ فون نمبر: ۳۲۴۴۶۸ / ۶۸۶۲۳۶

مشمولات (جلد اوّل)

مجلہ

تذکرہ سید مودودیؒ

مقالات

مولانا مودودیؒ — ایک سوانحی خاکہ — نعیم صدیقی

مولانا مودودیؒ — ہمہ پہلو شخصیت — پروفیسر منظور الحق صدیقی (راولپنڈی)

مولانا مودودیؒ — اور ان کے اسلاف — جناب فضل الٰہی قریشی (کوئٹہ)

مولانا مودودیؒ — میدانِ صحافت میں — جناب ایچ بی خان (کراچی)

مولانا مودودیؒ — عرب صحافہ کی نظر میں — احمد محمد جمال (مکہ معظمہ)

مولانا مودودیؒ — اسلامی دعوت کے اثرات — امین راج (استنبول)

اور

مکالمات — انٹرویوز

احساسات — سوالنامے کے جوابات

تاثرات — تاثراتی مضامین

یادداشت — غیر مطبوعہ ڈائریاں

نوادرات

تقریباً —— ۷۵۰ صفحات —— سائز —— ۲۰ × ۳۰/۸

زیرِ ادارت: مولانا نعیم صدیقی — معاون مدیران: جمیل احمد رانا، سلیم منصور خالد

جلد اوّل عنقریب شائع ہو رہی ہے

ناشر: مرکز معارفِ اسلامی منصورہ، لاہور ۱۸